حالات و مکتوبات

مولانا محمد علی

زاهد منیر عامر

مولانا تاج محمودؒ

حالات و مکتوبات

مؤلفہ

زاہد منیر عامر

ناشر

ادارہ مطالعہ تاریخ و تحقیق

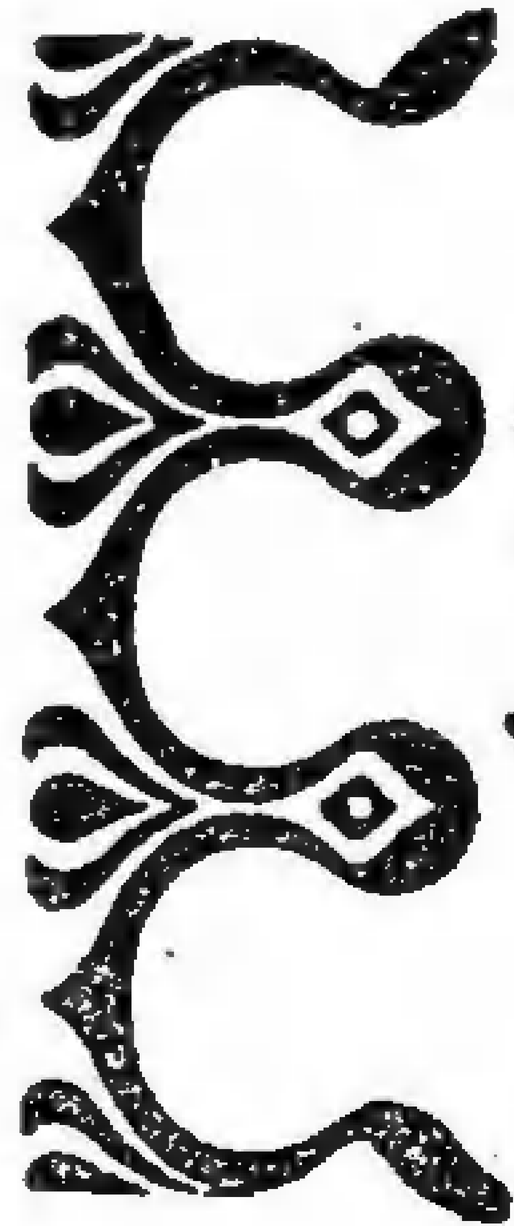
۹۲۔ اسلامپورہ سرگودھا

ضابطہ

طباعت باراول	اگست ۱۹۸۵ء
تعداد	پانچ سو
مطبع	ثنائی پریس سرگودھا
قیمت	مجلد، ۱۷ روپے۔ کارڈ کور، ۱۵ روپے
کتابت	محمد اخلاق چشتی کاموں کے
پروف ریڈنگ	امجد الٰہی تشنہ

بسم اللہ الرحمن الرحیم





مولانا تاج محمود رحمۃ اللہ علیہ

حالات و مکتوبات

انتساب

صاحبزادہ طارق محمود کے نام

جو اپنے والد کی جلائی ہوئی شمع کو اُن کی وفات کے بعد بھی
روشن رکھے ہوئے ہیں

زاہد منیر عامر

پیش لفظ

از

حضرت مولانا خان محمد صاحب دامت برکاتہم

امیر مجلس تحفظِ ختمِ نبوت پاکستان

مجاہدِ ملت حضرت مولانا تاج محمود صاحب رحمۃ اللہ علیہ ضلع ہزارہ کے مردم خیز علاقہ کے نامور سپوت تھے۔ ایسے عبقری قسم کے انسان قسمت سے پیدا ہوتے ہیں۔ مولانا مرحوم کا نام تو اکثر سننے میں آتا تھا مگر ان سے بالمشافہ تعارف حضرت مولانا سید محمد یوسف بنوری رحمۃ اللہ علیہ کے زمانۂ امارت مجلسِ تحفظِ ختم نبوت پاکستان میں ہوا اور جیسے جیسے ان سے تعارف بڑھتا رہا ان کے علم و فضل، اخلاص و جرأت اور ہمت و استقامت کے جوہر کھلتے چلے گئے۔

وہ مرنجاں مرنج طبیعت کے بزرگ تھے جو اپنے احباب کے لئے ابریشم سے بھی نرم اور معاندین اسلام کے لئے فولاد سے بھی سخت تر تھے۔ حال یہ تھا کہ پنجاب بلکہ صوبہ سرحد تک کے معتدل مزاج اہل حدیث، بریلوی، دیوبندی اور توحیدی حضرات کے لئے نقطۂ اتحاد تھے۔ ان کا دل اور دسترخوان سب کے لئے یکساں فراخ تھا یہی وجہ تھی کہ فیصل آباد کی تاریخ میں مولانا مرحوم کے جنازے پر ہر مسلک کے علماء و احباب کا بے مثال جم غفیر جمع ہو گیا تھا۔ ان کی وفات ملتِ اسلامیہ کے لئے اور خاص طور پر مجلس تحفظِ ختمِ نبوت کے لئے بے حد صدمے اور نقصان کا باعث ہوئی کیونکہ جب ان کا انتقال ہوا اس وقت تحریک تحفظ ختم نبوت کے خدام کو ان کی شدید ضرورت تھی "اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رٰجِعُوْن"

اللہ تعالیٰ مولانا مرحوم کو جنّت الفردوس نصیب فرمائے اور ان کے اکلوتے فرزند خلف الرشید صاحبزادہ

طارق محمود سلمہ کو صحیح معنوں میں ان کی تمام خوبیوں کا وارث بنا دے۔ آمین

فقیر بسفر حج کے لئے پا بہ رکاب ہے اور پھر وہ الفاظ بھی نہیں ملتے جو حضرت مولانا تاج محمود صاحب مرحوم کے کمالات کا احاطہ کر سکیں اس لئے عزیز نوجوان زاہد منیر صاحب عامر کے ارشاد کی تعمیل میں یہ چند ٹوٹے پھوٹے حروف لکھ دیئے ہیں

فقیر دعاگو ہے کہ اللہ تعالیٰ عزیزم زاہد منیر صاحب عامر کی اس جدوجہد اور عرق ریزی کو جو انہوں نے حضرت مولانا تاج محمود صاحب کے حالات اور مکتوبات کی حفاظت کے لئے سرانجام دی ہے مقبول و منظور فرمائے۔ مولانا تاج محمود مرحوم کے سوانح اور مکتوبات کی حفاظت ایک اہم فریضہ تھا جسے زاہد منیر عامر صاحب نے ہم سب کی طرف سے ادا کیا۔

جزاہ اللہ تعالیٰ احسن الجزا۔

فقیر

خان محمد عفی عنہ

از خانقاہ سراجیہ

۹ ذی قعدہ ۔ ۱۴۰۵ھ

سخنے چند

مکاتیب اور خطوط ہمارے لٹریچر کا ہر دور میں اہم حصہ رہے ہیں اور ہر زمانہ کے ارباب نظر اور اہل علم نے اس ذریعۂ علم سے پورا پورا کام لیا۔

دنیائے انسانیت کے سب سے بڑے معلم محمد عربی خاتم النبیین والمعصومین علیہ التحیۃ والتسلیم نے خود اس ذریعہ سے کام لیا چنانچہ اردو لٹریچر میں آپؐ کے دو نہایت درجہ مستند مجموعہ ہائے مکاتیب شائع شدہ موجود ہیں جن میں ایک مرتب کیا مولانا محمد حفظ الرحمن سیوہاروی ناظم جمعیۃ علماء ہند نے تو دوسرا مرتب کیا سید محبوب رضوی مرحوم نے جو دارالعلوم دیوبند کے کتب خانہ کے شعبہ مخطوطات کے انچارج تھے۔

آپؐ کے بعد آپؐ کی مسند مبارک پر یکے بعد دیگرے مسند افروز ہونے والے چاروں بزرگوں، سیدنا ابوبکر صدیق اکبرؓ، سیدنا عمر فاروق اعظمؓ، سیدنا عثمان غنیؓ اور سیدنا علی المرتضیٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہم میں سے اول الذکر تین کے مکاتیب کے مجموعے مرتب کئے ڈاکٹر خورشید احمد فارق دہلی یونیورسٹی نے اور آخری بزرگ کا مجموعہ مرتب کرنے والے حکیم نبی احمد خاں رامپوری ہیں۔

برصغیر ہند و پاکستان کی نامور علمی، دینی اور سیاسی شخصیات میں سے حضرت الامام مجدد الف ثانی حضرت الامام الشاہ ولی اللہ دہلوی، حضرت السید احمد بریلوی، حضرت شاہ غلام علی دہلوی، مرزا مظہر جانجاناں، حاجی امداد اللہ مہاجر مکی، مولانا رشید احمد گنگوہی، مولانا محمود حسن دیوبندی، علامہ شبلی نعمانی، مولانا اشرف علی تھانوی، مولانا سید حسین احمد مدنی، علامہ سید سلیمان ندوی، علامہ محمد اقبال، پنڈت جواہر لعل نہرو، گاندھی جی، مولانا محمد علی جوہر، مولانا ظفر علی خاں[1] اور مولانا ابوالکلام آزاد جیسی شخصیات کے مکاتیب و خطوط مرتب شدہ کتابی شکل میں دستیاب و موجود ہیں۔

---

[1] مولانا ظفر علی خاں مرحوم کے خطوط کا مجموعہ بھی زاہد منیر عامر کا مرتب کردہ ہے

لاہور کے ایک معروف اردو رسالہ "نقوش" کے مکاتیب نمبر اور خطوط نمبر میں سینکڑوں سے زیادہ مشاہیر کے نہایت درجہ قیمتی خطوط و مکاتیب شامل ہیں جو ہماری قومی زندگی کا نہایت اہم ریکارڈ ہے۔

زیر نظر کتاب میں شامل مکاتیب اگرچہ تعداد میں تھوڑے ہیں لیکن ہیں نہایت درجہ اہم۔ ان کے لکھنے والے ہیں مولانا تاج محمود اور جنہیں لکھے گئے وہ ہیں زاہد منیر عامر۔

اول الذکر اصل میں ہری پور ہزارہ کے باسی تھے لیکن فیصل آباد میں ساری زندگی گزار دی۔ اور اب فیصل آباد میں ہی آسودہ خواب ہیں۔ ثانی الذکر کا خاندان تقسیم ملک کے بعد سرگودھا آباد ہوا۔ والد بزرگوار جو نہایت درجہ صالح اور نیک انسان تھے "اللہ کو پیارے ہو گئے" سلیم الفطرت، نیک نفس اور باصلاحیت بھائیوں کے ساتھ وہ اب بھی سرگودھا میں مقیم ہیں۔

اول الذکر سے ان سطور کے راقم کے تعلقات کی تاریخ طویل ہے۔ وہ اور میرے والد بزرگوار حضرت مولانا محمد رمضان علوی، برعظیم کے ایثار پیشہ کارکنوں کی جماعت مجلس احرار اسلام کے حوالہ سے ایک ہی قافلہ کے سوار اور ایک ہی بزم کے ممبر تھے۔ دونوں کے تعلقات 'من تو شدم تو من شدی' کا مصداق تھے۔ اس لحاظ سے میں مولانا تاج محمود کا نیاز مند تھا اور ان کی بزرگانہ شفقتیں ہر حال میں مجھ پر ہی نہیں میرے سارے خاندان پر تھیں اور اب ان کے اکلوتے صاحبزادے برادر گرامی طارق محمود صاحب اسی طرح تعلقات کو نبھا رہے ہیں۔

برادر عزیز زاہد سلمہ، سے میرا ابتدائی تعارف ان کی کتاب "سید عطاء اللہ شاہ بخاری اور پاکستان" کے حوالہ سے ہوا بلکہ مجھے یہ فخر حاصل ہے کہ مولانا تاج محمود، جن کے اہتمام میں یہ کتاب چھپی، انہوں نے پریس سے آنے کے بعد اس کا سب سے پہلا نسخہ احقر کو مرحمت فرمایا جو میں نے غایت درجہ دلچسپی سے فیصل آباد سے لاہور تک کے سفر میں پڑھ ڈالا۔

احقر نے اس پر ایک مفصل تبصرہ 'خدام الدین' میں لکھا جس کا میں اس دور میں ایڈیٹر تھا اور پرچہ کی ایک کاپی برادرم زاہد کو بھیجی۔ جن کا جوابی خط آیا اور وہ تعلقات استوار کرنے کا ذریعہ بن گیا۔ الحمدللہ کہ ان تعلقات میں برابر اضافہ ہو رہا ہے اور محض اللہ تعالیٰ کی رضا کے لئے قائم ہونے والے تعلقات روز افزوں ہیں۔

مولانا تاج محمود نے یہ خطوط ان کے نام لکھے۔ زاہد صاحب اب چھپوانا چاہتے ہیں تو ان پر کچھ سطریں لکھنے کی مجھ سے فرمائش کی۔ مولانا المرحوم سے نیاز مندی کے تعلقات اور عزیزی زاہد سے برادرانہ تعلقات میں بچپایا تو سہی لیکن آمادہ ہوگیا۔ افسوس کہ جتنی جلدی ان کی خواہش اور میرا ارادہ تھا وہ پورا نہ ہوسکا۔

خطوط کا میں نے ایک ایک لفظ ایک مرتبہ نہیں دو مرتبہ انہماک اور توجہ سے پڑھا۔ ان پر زاہد کے حواشی پڑھے۔ "سید عطاء اللہ شاہ بخاری اور پاکستان" نامی زاہد کی تالیف کا ذکر آیا۔ ان خطوط کا مرکزی موضوع بھی کتاب ہے۔ زاہد نے ڈوب کر یہ کتاب لکھی، مولانا تاج محمود نے اشاعتی امور میں بھرپور رہنمائی کی۔

خطوط میں شاہ جی، مجلس احرارِ اسلام، تقسیم ملک کے بعد شاہ جیؒ کے نظریات، مجلس تحفظ ختم نبوت کا قیام اور اس کی خدمات، ایسے موضوعات پر مولانا تاج محمود جیسے شاہ جیؒ کے رزم و بزم کے ساتھی، بیدار مغز رہنما اور مخلص کارکن نے بڑی ہی قیمتی باتیں کہہ ڈالی ہیں جو یقیناً ہماری مستقبل کی تاریخ کا سرمایہ شمار ہوں گی۔

علاوہ ازیں کتاب کے آغاز میں عزیزی زاہد نے مولانا تاج محمود کے حالاتِ زندگی کا جو خاکہ ترتیب دیا ہے وہ بھی مولانا کی شخصیت کے مطالعہ میں نہایت درجہ مفید ثابت ہوگا۔

ان خطوط سے آزادیٔ وطن کی تحریک، انگریزوں کے خود کاشتہ پودے مرزائیوں کی سرگرمیاں اور ان کے بالمقابل اہلِ حق اور اہلِ دین کی جد و جہد کے کئی ایسے گوشے سامنے آئیں گے جو اب تک ہماری نگاہوں سے اوجھل تھے۔ خطوط کی ادبی حیثیت پر گفتگو میرے لئے مشکل ہے کہ یہ میرا موضوع نہیں اور میں اس کوچے کا آدمی نہیں لیکن جتنی کچھ اس کوچے سے شناسائی ہے اس کے پیشِ نظر یہ کہنا میرے لئے آسان ہے کہ اس اعتبار سے بھی خطوط منفرد اہمیت کے حامل ہیں۔ مولانا فارسی ادب کے رسیا اور اس کے مزاج شناس تھے اور ان خطوط میں "فارسیت" آپ کو جا بجا نظر آئے گی۔ برمحل اشعار اور تشبیہات و استعارات نے خطوط کو نہایت درجہ دلچسپ بنا دیا ہے۔

بہر طور عزیزی زاہد سلمہٗ ان خطوط کے مرتب کرنے پر تبریک کے مستحق ہیں۔ ہمیں امید ہے کہ ہمارے دینی اور سیاسی کارکن ان خطوط کا زبردست خیر مقدم کریں گے اور ان سے بھرپور استفادہ کریں گے۔

محمد سعید الرحمٰن علوی

۱۲۔ اے شاہ جمال۔ لاہور

حرفِ اوّل

ابتدا میں اس کتاب کو مولانا تاج محمودؒ کے خطوط اور ان کے حواشی تک محدود رکھا گیا تھا اور اس کے ابتدائیے بھی اسی نوعیت کے اعتبار سے لکھے گئے تھے مگر بعدہٗ اس میں مولانا کی سوانح اور شخصیت پر بھی مضامین شامل کر دیئے گئے۔ چنانچہ اب یہ صرف خطوں کا مجموعہ نہیں رہا بلکہ مولانا تاج محمودؒ کے حالات اور مکتوبات پر ایک جامع کتاب کی شکل اختیار کر گیا ہے۔

قارئین سے گزارش ہے کہ وہ کتاب کے ابتدائیوں کا مطالعہ کرتے ہوئے اس تبدیلی کو ملحوظ خاطر رکھیں۔

زاہد منیر عامر

تقدمہ

مولانا تاج محمود مرحوم جب بقیدِ حیات تھے تو ہر ہفتے یا دوسرے ہفتے ان سے ملاقات ہو جایا کرتی تھی اور اگر کبھی کوئی ایسا مانع درپیش آ جاتا کہ مولانا سے ملاقات کی کوئی سبیل نہ بن سکی تو یا میں مولانا کو عریضہ تحریر کر دیا کرتا تھا یا پھر مولانا از راہ کرم مجھے یاد فرما لیا کرتے تھے۔ اتفاق کی بات کہ اس مراسلت کا آغاز بھی مولانا کے گرامی نامہ سے ہوا اور اختتام بھی انہی کے خط پر ہوا جو مجھے ان کی وفات سے صرف دو روز قبل یعنی ۸ار جنوری ۸۶ء کو موصول ہوا۔ ابھی میں اس کا جواب لکھ بھی نہ پایا تھا کہ مولانا نے ۱۰ر جنوری ۸۶ء کی صبح دس بجے داعیٔ اجل کو لبیک کہہ دیا اور اس طرح یہ باب از خود مکمل ہو گیا۔

میرے پاس مولانا کا جو بھی خط آیا اسے چونکہ میں نے حرزِ جاں بنا کر رکھا اس لئے میرے پاس مولانا کے تمام خطوط از اول تا آخر بالکل محفوظ رہے۔

گذشتہ دنوں ایک شام کو اچانک یہ خیال آیا کہ مختلف النوع موضوعات پر مشتمل مولانا کے خطوں کی حفاظت کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ انہیں شائع کر دیا جائے۔ اور پھر جلد ہی اس خیال نے ارادے کی شکل اختیار کر لی اور اس ارادے کی تقویت کا اصل سبب ان خطوں کی افادیت تھی، کیونکہ ان کی حیثیت محض نجی نوعیت کے خطوط کی نہیں ہے بلکہ ان کے ذریعے ہمیں تاریخ ماضی کے بہت سے گوشوں سے آگاہی حاصل ہوتی ہے جن میں سید عطاء اللہ شاہ بخاری مرحوم کے کارہائے نمایاں اور قیامِ پاکستان کے بعد اُن کی اور اُن کے ساتھیوں کی زندگیوں میں رُونما ہونے والی تبدیلیوں کا تذکرہ بھی شامل ہے۔

علاوہ ازیں پاکستان کی تاریخ کے ایک اہم دور (ابتدائی سالوں) میں ان مجاہدین

حریت کے محسوسات اور کیفیات بھی ہم پر آشکار ہوتی ہیں جنہوں نے حصولِ آزادی کے لئے تو اپنا تن من دھن سب کچھ قربان کر دیا لیکن وطنِ عزیز میں انہیں نہ تو جائز مقام دیا گیا اور نہ ان کی خدمات سے فائدہ اٹھانے کے لئے انہیں کوئی درست لائن آف ایکشن دی گئی (یا لینے نہ دی گئی) اور اس طرح بہت سے جفاکش اور ایثار پیشہ لوگ گوشہ گیری اور بے دلی کی زندگی گزارنے پر مجبور ہو گئے۔

ان خطوں کا بین السطور ہمیں بتاتا ہے کہ یہی وہ مایوسیاں اور غیر یقینی مستقبل کے اشارات تھے جنہوں نے اس صورت کو جنم دیا جو آگے چل کر خود بعض مخلصین میں غلط فہمیوں اور اندیشہ ہائے دور دراز کی پیدائش کا سبب بنے جن کے نتیجے میں ملک کے عوام کی فکری تربیت متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکی۔ اگر ہم بالغ نظری اور مکمل غیر جانبداری سے ان حالات کا تجزیہ کریں تو ہمیں اب تک اپنے ملک کی اساسی نظریہ سے دوری اور محرومیوں میں اس نوع کے عوامل کا بہت سا ہاتھ دکھائی دے گا۔

میرے خیال میں قیام پاکستان کے بعد اگر گزشتہ رنجشوں اور تلخیوں کو جذبہ تعمیرِ وطن کے تحت فراموش کر دیا جاتا تو ملک میں آنے والے تمام طبقات آپس کے تعاون اور اتحاد سے ملی عمارت کو مضبوط بنیادوں پر استوار کرتے اور اس صورت میں ہماری جغرافیائی، سیاسی، تمدنی اور معاشی حالت یقیناً ایسی نہ ہوتی جیسی کچھ اب ہے۔

بہر حال یہ ایک طویل بحث ہے جس کے موٹے موٹے اشارے ہمیں اس مجموعہ کے بعض طویل خطوں میں ملتے ہیں۔

اس وسیع و عریض مضمون کے علاوہ یہ خط ہمیں ایک ایسے شخص کی زندگی سے روشناس کراتے ہیں جس کے پاس نہ تو دنیاوی جاہ و مناصب تھے اور نہ زر و دولت سے اس کا دامن مالا مال تھا لیکن اس کے باوجود اس شخص نے اپنی زندگی کی عمارت کو اپنے عزم اور جہدِ مسلسل کے بل بوتے پر اس طرح تعمیر کیا کہ اس کی داستانِ حیات بہت سے "تازہ واردانِ

بساط ہوائے دل" کے لئے روشنی کا ایک مینار بن گئی۔

مولانا تاج محمودؒ نے جدید تعلیم کی واجبی سی مقدار کے حامل ہونے کے باوجود بہت سے تعلیم یافتہ ذہنوں کو اس طرح متاثر کیا کہ وہ مولانا کا مشن اختیار کرنے پر مجبور ہو گئے۔

مولانا کی گفتار اور کردار عبارت تھے اس جذبہ سے جو نہ صرف یہ کہ ان کا مشن تھا بلکہ ان کا حاصلِ زیست بھی تھا یہ ان کی حضور خاتم المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم سے بے پناہ اور والہانہ عقیدت و محبت کا نتیجہ تھا کہ وہ زندگی کے بیشتر محاذوں پر کامرانیوں اور کامیابیوں سے اپنا دامن مالا مال کرتے رہے۔

یہ ان کا بے پناہ عزم تھا کہ انہوں نے اپنی تمام تر مشکلات اور پریشانیوں کے باوجود ملک میں وقتاً فوقتاً اٹھنے والی قومی تحریکات میں حصّہ لیا اور نہ صرف حصّہ لیا بلکہ ان تحاریک کی راہنمائی اور قیادت کے فرائض بھی نہایت خوش اسلوبی سے سرانجام دیئے اور پھر قادیانیت کے مسئلہ پر ۱۹۷۴ء میں وہ اپنی کاوشوں کا پھل بھی چکھ گئے۔

یہ بھی مولانا کا عزم تھا کہ انہوں نے مختلف اوقات میں مسلمان بچوں میں تعلیم کے فروغ کے لئے دو ادارے قائم کئے جو تادم تحریر علم کی روشنی بانٹنے میں مصروف ہیں۔

مولانا نے اپنی بے پناہ قوت ارادی کے بل بوتے پر ۱۹۶۲ء میں ایک دینی ہفت روزہ " لولاک " کا بھی اجرا کیا جو گزشتہ اکیس برس سے مسلسل اشاعتی محاذ پر باطل کی سرگرمیوں کا تعاقب و احتساب کرنے میں مصروف ہے۔ علاوہ ازیں انہوں نے خطباتِ جمعہ اور دیگر خطبات اور سرگرمیوں کے ذریعے بھی اپنی اصلاحی و تعمیری کاوشوں کو جاری رکھا۔

یہ کوائف پتہ دیتے ہیں ایک ایسے انسان کا جو اخلاص و وفا کا پتلا تھا اور جس کے ہاں نقدِ جاں کا مصرف سوائے اس کے اور کچھ نہ تھا کہ وہ اسے ناموسِ رسالت پر قربان کر دے

مولانا تاج محمودؒ کا طرزِ حیات اتنا دلکش تھا کہ ان سے ملنے والا ہر شخص ان کا گرویدہ ہو جایا کرتا تھا اور کیا اپنے کیا پرائے سب اپنے مسائل و مشکلات کے حل کے لئے انہی کے

[illegible] تھے [illegible] جن کا احساس بھی [illegible]
[illegible]
[illegible] تھے۔

ان خصوصیات [illegible] کو مختصراً یہی [illegible] ایک [illegible] کی [illegible]۔

مولانا [illegible] کہ اس کا [illegible] کا ذکر ہے [illegible] کے لئے لکھے گئے ہیں اس لئے ان میں آپ کو [illegible] بھی [illegible] نظر آئے گا اور بعض جگہوں پر مولانا کے بیان میں [illegible] بھی [illegible] آگئی ہے اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ خط لکھتے وقت مولانا کے پیش نظر ایسا کوئی خیال نہ تھا کہ کل کو یہ خطوط شائع بھی ہوں گے اس لئے ہر خط میں بات سمجھانے کا اسلوب اپنایا ہوا نظر آتا ہے بات بنانے کا نہیں۔

ان خطوط کی تعداد ستائیس ہے۔ لیکن بعض خطوط کی طوالت نے مجموعے کے حجم کو ایک کتابچے کی شکل دے دی ہے اور آخر میں ۱۹۵۳ء کی تحریک ختم نبوت کے سلسلہ میں مولانا جب گرفتار ہو کر [illegible] سال کے لئے نظربند ہوئے تو جیل سے لکھے ہوئے ان کے دو خطوط بھی بطور یادگار شامل کر دیے ہیں جو ان کے ایک عزیز مولانا محمد صادق صاحب مرحوم کے نام لکھے گئے تھے۔

اگر مجھے اس بات کا احساس ہوتا کہ مولانا اس قدر جلد ہم سے بچھڑ جائیں گے تو میں ان سے جلدی جلدی بہت سے خطوط لکھوا کر محفوظ کر لیتا۔ لیکن افسوس کہ مجھے تو اس بات کا علم ہی مولانا کی وفات کے بعد ہوا کہ مولانا نے بھی ایک دن ہم سے جدا ہو جانا تھا۔

ایک شخص کے نام ایک ہی شخصیت کے خطوط پر مشتمل یہ کوئی پہلا مجموعہ نہیں بلکہ اس سے پہلے بھی اس نوعیت کی بہت سی مثالیں ملتی ہیں جیسے مولانا مسعود عالم ندوی نے اپنے نام مولانا سلیمان ندوی کے خطوط کو "مکاتیبِ سلیمان" کے نام سے شائع کیا۔ سید نذیر نیازی مرحوم نے علامہ اقبالؒ کے اپنے نام خطوط کو "مکاتیبِ اقبال" کے عنوان سے شائع کیا۔ علامہ اقبال کے ہی مولانا غلام قادر گرامی کے نام خطوں کا مجموعہ شائع ہوا۔ مرزا سلطان احمد نے اپنے نام اکبر الہ آبادی کے خطوں کو "مکتوباتِ اکبر" کے نام سے شائع کیا۔ مولانا عبدالماجدؒ دریاآبادی نے اپنے نام مشاہیر کے خطوں کو مختلف جلدوں میں مدوّن کیا۔ اور عبداللہ ملک نے اپنے نام شورش کاشمیری کے خطوط کا مجموعہ "شورش بنام عبداللہ ملک" کے نام سے شائع کیا۔ علاوہ بریں اس سلسلہ میں اور بہت سی مثالیں بھی دی جاسکتی ہیں۔

ان خطوط کا مخاطب ایک کم سواد طالب علم ہے اور ان خطوط کی اشاعت کا مقصد یہ ہے کہ ایک بزرگ کی ان یادگار تحریروں کو دستبرد زمانہ کے ہاتھوں بچانے کی صورت پیدا کی جاسکے کیونکہ احقر نے بہت سے لوگوں کے ساتھ پیش آنے والا یہ المیہ دیکھا کہ انہوں نے اپنے نام آنے والے مشاہیر کے خطوط کو "کل" کے انتظار میں اٹھائے رکھا لیکن یہ کل آنے سے پہلے پہلے خود اس دارفانی سے کوچ کر گئے۔ خود مولانا تاج محمودؒ مرحوم کے پاس بعض مرحوم اکابر کے بہت سے قیمتی خطوط موجود تھے اور مولانا ان کی اشاعت بھی چاہتے تھے مگر اسی "کل" کے خیال کے باعث وہ انہیں مرتب نہ کرسکے یہاں تک کہ وہ خود مرحومین کی صف میں شامل ہوگئے۔

اس کام کو سرانجام دینے کی راہ میں پیش آنے والے موانع میں شاید کسی درجہ انکساری کو بھی دخل ہو کہ بعض خطوط مکتوب الیہ کی شخصیت کے بارے میں ہوتے ہیں مگر احقر کے خیال میں بڑے آدمیوں کے خطوط ایک امانت کا درجہ رکھتے ہیں اور انسان امانت کے بارِگراں سے جس قدر جلد سبکدوش ہوجائے اتنا ہی اچھا رہتا ہے اس لئے راقم نے ان خطوط کی اشاعت کا خیال آتے ہی بعجلت تمام ان کے مسودات کو مکمل کیا اور ضروری حواشی لکھ کر طباعتی امور کا انتظام

کیا، مبادا کہیں میں بھی اپنی دوسری مصروفیات میں الجھ کر اس کام کو کل پر اٹھا دوں۔ میں اس امانت کی ادائیگی میں کس حد تک کامیاب ہوا ہوں؟ یہ فیصلہ قارئین کرام کے ہاتھوں میں ہے۔

زاہد منیر عامر

سرگودھا
۲۳ مارچ ۱۹۸۵ء

تقریب

انسانی زندگی کے دوائر کی نوعیت کچھ ایسی رہی ہے کہ ان میں نشیب و فراز کے تصوّر کے بغیر داستانِ حیات تشنۂ تکمیل رہتی ہے۔ دل کے بحرِ اوقیانوس پر اگر کوئی کشتی تیرنا شروع کر دے تو تمام کنارے گم ہو جاتے ہیں جب کہ دماغ کا بحرِ اعظم صبح و شام بجانے کتنی ہواؤں اور موسموں کو اپنی آغوش میں لے کر ماضی کے سرد خانوں میں دھکیلتا رہتا ہے۔

سید عطا اللہ شاہ بخاری مرحوم پر اپنی کتاب لکھنے کے بعد میں شاہ صاحبؒ کے کسی ایسے دوست کی تلاش میں، جو میری تحریر پر حرفِ تصدیق ثبت کرے ایک انجان اور اپنی معلومات کے لحاظ سے گمنام شخص تک پہنچ گیا جس کا نام تاج محمود تھا اور جسے دنیا "مولانا" کے سابقے سے یاد کرتی ہے۔

۷ر جون ۸۲ء کی شام کو میں ایک مشتِ استخوان کے رُوبرُو بیٹھا اپنی قلمی کاوش کے اوراق سنا رہا تھا۔ وہ شخص جو چند لمحے پیشتر میری عمر کی طرف دیکھ کر مجھے بہلانے کے انداز میں ذرا اثر ا ہونے کا انتظار کرنے کے لئے کہہ رہا تھا اب میری تحریر پر اس طرح داد دے رہا تھا کہ مجھے محسوس ہوا گویا میں کسی فردِ واحد کے سامنے اپنی نثری تصنیف کا مضمون نہیں سنا رہا بلکہ کسی مشاعرے میں کوئی شعری تخلیق سنا کر سامعین سے داد وصول کر رہا ہوں۔

یہ مجلس برخاست ہوئی تو وہ اجنبی میرے لئے شفقتِ پدری کا منبع بن چکا تھا۔ اور پھر ایام ہفتوں کے سانچوں میں ڈھل کر مہینوں کی شکل میں جلوہ گر ہونے لگے تو میرے "مہربان"

کی محبت و اخلاص میں اضافہ اور عمر میں کمی ہوتی گئی۔

میرا کاروانِ خیال ایک نکتے پر جا کر رک گیا۔ یہ وہ مقام تھا جہاں زندگی اور موت کے ادراک کی سرحدیں بہت پیچھے رہ جایا کرتی ہیں۔ سفر جاری رہا تا آنکہ راستہ میں موت کا ہولناک صحرا آن پڑا اور زندگی کے سفر میں کبھی نہ رکنے اور کبھی نہ جھکنے والے شخص نے اپنی روایت حیات کو قائم رکھتے ہوئے بلے دھڑک اس میں قدم رکھ دیا۔

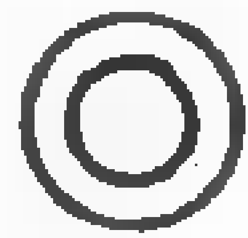
اور اس کے بعد میرے اندر ایک طوفان اٹھا جو یکایک ایک سناٹے میں جذب ہو کر رہ گیا۔ اور ابھی میں سناٹے کے اسی بھنور میں ہوں۔ اس سے نکل پاؤں گا یا نہیں؛ اس کے بارے میں میں خود نہیں جانتا۔ البتہ اتنا ضرور ہے کہ میں نے اپنی داستان کو بزم دوستاں تک پھیلانے کی سعی کی ہے کیونکہ ؎

ہمارا راز ہمارا نہیں سبھی کا ہے
چلو کہ سارے زمانے کو راز داں کر لیں

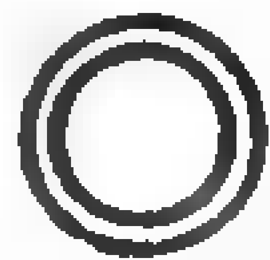
قارئین مولانا سے میرے تعلق کو کس پیمانے سے ناپتے ہیں؟ یہ خود ان پر منحصر ہے۔ البتہ میں اپنے تعلق کو وقت کے پیمانے سے نہیں ناپ سکتا کیونکہ میں نے جب بھی ایسی کوشش کی ہے مجھے پونے دو برس کا قلیل عرصہ پونے دو صدیوں پر محیط نظر آیا ہے اور اس کوشش کے دوران مجھے ہمیشہ دریچۂ دل سے شاخ تنہا پر بیٹھی کسی کوئل کی پکار کی طرح یہ آواز سنائی دی ہے کہ

ع دوڑ پیچھے کی طرف اے گردشِ ایام تو

مولانا تاج محمود رح



سوانحی خاکہ



قلمی چہرہ

دل کے غنی ۔ زبان کے دھنی ۔ بات نیزے کی انی ۔ شاہ جی رح کے عشق اور افضل حق رح کے فکر کی تصویر، صحیح العقیدہ مسلمان فیصل آباد کے زندہ دلوں کی روحِ رواں ۔ بے عیب اللہ کی ذات ہے لیکن کوئی سی بھی معصیت ان کے خیال کو چھو کر نہیں نکلی ۔ ایک اُجلا اور صاف ستھرا انسان جو شاید دھوکا کھا سکتا ہے دھوکا دے نہیں سکتا۔ عربی کی مشہور کہاوت ہے کہ حسن وہ ہے جس کا سوکنوں کو بھی اعتراف ہو ۔ تاج محمود کے مخالف بھی اس کی گواہی دیتے ہیں ۔ ضروری نہیں کہ ہر شخص ہر شخص سے متفق ہو یا ہر انسان کو ہر خیال سے اتفاق ہو ۔ مولانا تاج محمود کے خیالات سے اختلاف ہو سکتا ہے اور لوگوں میں اس قسم کے اختلافات ہمیشہ ہی ہوتے ہیں،
تاج محمود بھی بہر حال ایک انسان ہے ۔ اس سے بھی لوگوں کو اختلاف ہے اور رہے گا لیکن یہ شہادت کہ وہ ایماندار ہے، مخلص ہے، صاحبِ عزم ہے اور ناقابلِ خرید ہے، ایک ایسا اعزاز ہے جو اس دنیا میں معاصرت کے دربار سے شاید ہی کسی کو ملتا ہے ۔ ان کے سامنے صرف ایک ہی دنیا ہے اور وہ حضور سرورِ کونین صلی اللہ علیہ وسلم کے عشق و محبت کی دنیا ہے ۔ حضور علیہ السلام کی ذاتِ اقدس سے انہیں بے پناہ محبت ہے ۔ اس میں سرِ مو فرق نہیں اس معاملے میں مسلمان بھی ہیں مومن بھی، قلندر بھی ہیں، مجذوب بھی، سالک بھی ہیں صوفی بھی، مجاہد بھی ہیں اور نمازی بھی ۔ حتّٰی کہ اس عشق کی تیغِ جگردار کا ہم انہیں شہید بھی کہہ سکتے ہیں۔

اگر بہ او نہ رسیدی تمام بولہبی است

قد دراز ۔ طبیعت گداز ۔ مزاج میں سوز و ساز ۔ شوق میں پرواز ۔ سیرت میں اعجاز ۔ عمر میں جوانی کا ولولہ ۔ رنگ گندمی ۔ ماتھا کھلا ۔ آنکھیں روشن ۔ ناک ستواں ۔ رفتار میں تحمل ۔ گفتگو میں تجمّل ۔ دل آئینہ ۔ سادہ فطرت ۔ سادہ سرشت ۔ عیب بین نہ عیب جین ۔ اقبال رح کے تخیلی مسلمانوں میں سے ایک ۔

شورش کاشمیری

خاندانی پس منظر

مولانا تاج محمودؒ کے آباؤاجداد دریائے سواں ضلع راولپنڈی کے کنارے واقع ایک گاؤں میں آباد تھے۔ سواں سے لے کر سون سکیسر کی پہاڑیوں تک سطح مرتفع کی قسم کے اس علاقہ میں اعوان قوم آباد ہے۔ مولانا کے خاندان کا تعلق بھی اسی اعوان قوم سے تھا۔

اس علاقہ کے بالائی حصہ کو اعوان کاری اور پوٹھوہار بھی کہا جاتا ہے۔ کسی زمانہ میں کسی بیرونی حملہ آور کے حملہ یا اندرون ملک طوائف الملوکی اور خانہ جنگی کے ڈر سے یہ لوگ اپنا گھر بار چھوڑ کر کوہ گنگر ضلع ہزارہ جا پہنچے۔ یہ سلسلۂ کوہ تربیلہ اور ہری پور کے درمیان دریائے سندھ کے کنارے کنارے چھچھ تک آباد ہوا ہے۔ اس سرسبز پہاڑی میں یہ لوگ اپنے مویشی چرا کر گذر بسر کرتے رہے بعد ازاں جب امن قائم ہوا تو یہ لوگ دو گروہوں کی شکل میں وہاں سے منتقل ہوئے۔ ان میں سے ایک گروہ نے "لسولے" نامی جگہ کو اپنا مسکن بنایا اور پھر آہستہ آہستہ وہاں سے قریب ایک "جاگل" نامی گاؤں میں کچھ زمینیں خرید کر آباد ہو گئے۔ اور اس طرح یہ "پوٹھوہاری" لوگ "ہزاروی" ہو گئے۔ مولانا کے خاندان کو اب بھی اس علاقہ میں پوٹھوہاری اعوان کہا جاتا ہے۔

وہ بزرگ کون تھے، جو دریائے سواں سے اٹھ کر ہزارہ میں جا آباد ہوئے۔ یہ معلوم نہیں ہو سکا۔ البتہ مولانا کی چوتھی پشت کے بڑے بزرگ کا نام "فیض اللہ خاں" تھا۔ اور یہ نام ضلع راولپنڈی یا پوٹھوہار کے علاقہ کا نام نہیں ہے بلکہ یہ پختون علاقہ کا نام ہے۔ ہری پور ہزارہ

کے گرد و نواح کی زبان ہندکو ہے لیکن ہری پور سے چند میل مغرب میں واقع کوہ گنگر کے اوپر آباد لوگوں کی زبان پشتو ہے ۔ اس لحاظ سے یہ قیاس کیا جا سکتا ہے کہ مولانا کے جدِ امجد فیض اللہ خاں کی پیدائش اس زمانہ کی ہے جب یہ خاندان کوہ گنگر پر آباد تھا ۔

فیض اللہ خاں کے ہاں دو بیٹے مہر محمد اور خیر محمد پیدا ہوئے ۔ خیر محمد شہیدؒ فی سبیل اللہ مجاہدِ حریت حضرت سید احمد شہیدؒ کے مجاہدین میں شامل تھے ۔ سکھوں کے دورِ حکومت میں خیر محمد ، حضرت سید احمد بریلویؒ کی افواج کے ساتھ زرہ بند ہو کر اور تلوار ، نیزہ ڈھال وغیرہ سے لیس ہو کر رات کے وقت اپنے گاؤں سے نکل جاتے اور تین تین مہینے تک جہاد اور اس کی تیاریوں میں مصروف رہنے کے بعد چند دنوں کے لئے گھر آیا کرتے تھے ۔ اہل خانہ صرف اتنا جانتے تھے کہ وہ سکھوں کے خلاف جہاد میں مصروف ہیں ۔ ان کے قیام اور مقام کے بارے میں جملہ تفصیلات صیغہ راز میں رہتی تھیں ۔

خیر محمد کے ہاں ایک لڑکا پیدا ہوا جس کا نام فیض اللہ خاں رکھا گیا ۔ فیض اللہ خاں کے ہاں دو بیٹے تولد ہوئے جن میں سے ایک کا نام محمد حبیب اور دوسرے کا نام مرید احمد رکھا گیا ۔ مرید احمد اولاد کی نعمت سے محروم اس دنیا سے چل بسے ۔ جب کہ مولانا محمد حبیب کے چار بیٹے اور دو بیٹیاں تھیں ۔ مولانا تاج محمود ، ۵ جنوری ۱۹۱۷ء کو مولانا محمد حبیب کے ہاں ہزارہ میں پیدا ہوئے ۔

ہجرت

مولانا تاج محمود کے اپنے بیان کے مطابق اُس وقت ان کی عمر چھ ماہ تھی جب مولانا محمد حبیب (مولانا تاج محمود کے والد گرامی) اپنے خاندان کے ہمراہ ، ہزارہ سے ہجرت کر کے چنیوٹ کے ایک گاؤں ۱۲۸ ۔ ج ۔ ب موسومہ لوٹاں میں منتقل ہو گئے ۔

مولانا کی تاریخ پیدائش ۵ جنوری ۱۹۱۷ء ہے اس لحاظ سے یہ واقعہ جولائی ۱۹۱۷ء کا ہے ۱۹۱۷ء سے ۱۹۲۷ء تک ۔ مولانا اپنے والدین کے ہمراہ چنیوٹ میں رہے اور ۱۹۲۷ء میں

لائل پور آگئے جہاں پہلے دارالعلوم فتح دین، پھر کاٹن مل کے علاقہ میں رہنے کے بعد ریلوے کالونی فیصل آباد کی مسجد سے متصل رہائش اختیار کر لی اور پھر تادم واپسیں یہیں مقیم رہے۔

تعلیم

مولانا تاج محمودؒ کے والد انہیں دینی و دنیاوی علوم سے بہرہ ور کرنا چاہتے تھے۔ اس مقصد کے لئے انہوں نے چنیوٹ آنے کے بعد مولانا کو ایک مقامی سکول داخل کرا دیا۔ جہاں سے مولانا نے فارسی اور زراعت کے مضامین کے ساتھ ۱۹۳۲ء میں مڈل کا امتحان پاس کیا۔ بعد ازاں مولانا عبدالرحمٰن ہزاروی سے فارسی پڑھی۔ ملا جامی کی یوسف زلیخا اور اس سے بعد کی کتابیں مولانا محمد یار مرحوم نے پڑھائیں جو چک ۱۳۰ ج ب میں مقیم تھے۔

اس کے بعد مولانا کو پٹواری بننے کا شوق چرایا اور پٹواری کورس مکمل کیا لیکن اسی دوران مولانا کے برادرِ اصغر، محمد اشرف قضائے الٰہی سے وفات پا گئے۔ اس صدمہ کا مولانا کی طبیعت پر گہرا اثر ہوا۔ تمام شوخیاں اور دلچسپیاں ختم ہو گئیں اور پٹوار کا کورس مکمل کر لینے کے باوجود وہیں چھوڑ دیا اور مولانا اپنے آبائی گاؤں (ہزارہ) آ گئے اور کھیتی باڑی شروع کر دی۔ اس کام نے مولانا کا دل بہلا دیا اور غمِ حیات کو پیوند زمین کر کے اوپر ہل چلانے لگے۔

پھر ایک دن مولانا محمد حبیب اپنے فرزند ارجمند مولانا تاج محمودؒ کو اپنے پیر و مرشد حضرت باغدرہ شریفؒ کی خدمت میں لے گئے۔ انہوں نے مولانا سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو اپنے خاص مقاصد کی تکمیل کے لئے پیدا فرمایا تھا لیکن آپ خواص کی صف سے نکل کر عوام کی صف میں آنا چاہ رہے ہیں۔ یہ بات مجھے سمجھ نہیں آتی۔

قلندر کی یہ بات اثر کر گئی اور مولانا اسی دن کھیتی باڑی کے تمام سلسلے ترک کر کے واپس چنیوٹ آ گئے جہاں سے ان کے والد گرامی نے انہیں دارالعلوم فتح دین عبداللہ پور۔ لائل پور میں داخل کرا دیا۔ یہاں انہیں حضرت مفتی محمد یونس مراد آبادیؒ جیسا فاضل استاد میسر آیا۔

دارالعلوم فتح دین سے مولانا نے شعبان ۱۳۵۰ھ میں سندِ فراغ حاصل کی۔
مولانا ابھی طالب علم ہی تھے کہ مفتی یونس صاحبؒ نے ریلوے کالونی لائل پور (فیصل آباد)
کی مسجد (جو اس وقت ایک جھونپڑے کی شکل میں تھی) کی امامت کے فرائض آپ کو سونپ دیتے
اس کے علاوہ مولانا نے ۱۹۵۰ء میں پنجاب یونیورسٹی سے منشی فاضل کا امتحان بھی پاس کیا۔

تدریس

مولانا نے امامت کا آغاز تو ۱۹۳۹ء میں ہی کر دیا تھا جب ریلوے
کالونی لائل پور کے نمازیوں کی فرمائش پر مفتی محمد یونس صاحبؒ نے وہاں کی مسجد کی امامت
کے لئے آپ کو مقرر کیا تھا مگر مولانا کی درس و تدریس کا آغاز ۱۹۴۸ء سے ہوتا ہے۔
جب آپ نے مدرسہ کی تعلیم سے فراغت کے بعد لائلپور کاٹن ملز کی مسجد میں قرآن پاک
کی تدریس کا سلسلہ شروع کیا

بعد ازاں ۱۹۵۲ء میں مولانا نے ایم بی ہائی سکول فیصل آباد میں اسلامیات کے
ٹیچر کی حیثیت سے پڑھانا شروع کیا۔ ۱۹۵۳ء کی تحریک ختم نبوت کے دوران جب آپ
گرفتار ہوئے تو اس وقت ایم بی ہائی سکول کے ٹیچر تھے اور تحریک کی سرگرمیوں کی وجہ
سے ان دنوں سکول سے ایک ماہ کی چھٹی پر تھے۔

۱۹۵۴ء میں جب ایک برس کی قید کاٹنے کے بعد رہا ہوئے تو مولانا نے
اپنی زندگی کی عمارت کو از سرِ نو تعمیر کیا کیونکہ اس تحریک میں مولانا کا سارا گھر لٹ چکا تھا اور اہلِ
خانہ فاقوں سے دوچار تھے۔ چنانچہ آپ نے منشی فاضل، ایم اے اردو اور فارسی وغیرہ کے
امتحانات کی تیاری کرانے کے لئے ایک پرائیویٹ ادارہ اردو فارسی کالج کے نام سے
قائم کیا۔ مولانا اس کالج کے پرنسپل تھے اور یہاں بڑے بڑے نامور لوگ پڑھتے اور
پڑھاتے رہے۔ اردو فارسی کالج میں تدریس کا یہ سلسلہ ۱۹۶۷ء تک جاری رہا۔

قومی تحاریک میں حصہ

مولانا تاج محمودؒ نے ایک تحریکی اور انقلابی زندگی گزاری۔ انہوں نے اپنے دور میں اٹھنے والی ہر اس تحریک میں نہ صرف حصہ لیا بلکہ بعض اوقات اس کے روحِ رواں بھی رہے جس کا مقصد ناموسِ رسالت ﷺ کا تحفظ، جبر و استبداد سے خلاصی یا اعلائے مذہبی و ملی اقدار کا احیا تھا۔

چونکہ مولانا کی شعوری زندگی کا آغاز ہی تحریکی ماحول میں ہوا تھا اس لئے بھی متحرک زندگی ان کے رگ و پے میں سمائی ہوئی تھی۔ مولانا نے شعور کی آنکھ کھولی تو اس وقت برصغیر پر انگریز حکمران تھے۔ بحیثیت مجموعی ہماری قومی آزادی سلب ہو چکی تھی۔ ہماری تمام شرعی و ملی اقدار کو مٹانے کی ہر ممکن سعی کی جارہی تھی۔ غرضیکہ ہمیں ہر لحاظ سے پسماندہ رکھے جانے کی کوششیں کی جارہی تھیں۔ ان حالات میں مسلمان اپنے وجود کی بقا اور اپنے نظریاتی تحفظ کے لئے ایک آزاد وطن کے حصول کی جنگ لڑ رہے تھے۔ مولانا نے ہوش سنبھالتے ہی اپنے آپ کو اس جدوجہد میں شامل کر دیا اور انہوں نے اپنے وقت کے سب سے بڑے خطیب اور سیاسی و مذہبی راہنما امیرِ شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ کی ایک تقریر سے متاثر ہو کر آزادی کے حصول کی جدوجہد کے لئے شاہ صاحبؒ کی جماعت مجلس احرار اسلام کے پلیٹ فارم کا انتخاب کیا۔

قیامِ پاکستان تک ان کی سرگرمیاں حصولِ آزادی کے لئے وقف رہیں اور جب پاکستان کا قیام عمل میں آگیا تو وہ سو سال کی ملی جدوجہد کے بعد حاصل ہونے والے اس ملک کی تعمیر و ترقی میں مصروف ہو گئے۔

قیامِ پاکستان کے بعد ان کی مجاہدانہ سرگرمیوں کا پہلا ہدف قادیانیت ہے۔ یہ ایک ایسا گروہ تھا جس کے نزدیک حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کا لایا ہوا دین، جو کہ قیامت

تک کے آنے والے انسانوں کے لئے نورِ ہدایت ہے، نعوذ باللہ نامکمل اور ناقص تھا اور پاکستان کو دوبارہ ہندوستان میں ضم کر دینے کی کوشش کرنا جس کا مذہبی عقیدہ و فریضہ ہے[1] ۔یہی وجوہ تھیں جن کی بنا پر مولانا تاج محمودؒ نے دیگر اکابر کی طرح پہلے دن سے ہی اس فتنہ کے تعاقب واحتساب کو اپنا مشن اور مقصدِ حیات بنایا

تحریکِ ختمِ نبوت ۱۹۵۳ء

۱۹۵۳ء میں جب ایک مخصوص پس منظر کے تحت ملک میں تحفظِ ختمِ نبوت تحریک کا آغاز ہوا تو مولانا تاج محمودؒ نے اپنی تمام تر توانائیوں اور صلاحیتوں کے ساتھ اس میں حصّہ لیا۔ ان دنوں وہ ایم۔ بی ہائی سکول لائل پور (اب فیصل آباد) میں اسلامیات کے ٹیچر تھے۔ مگر انہوں نے سکول سے چھٹیاں لے کر اپنی تمام تر توجہات کو تحریک کی طرف مرکوز کر دیا اور اپنی شب و روز کی جدّ وجہد اور اخلاص کی بنا پر لائلپور کو تحریک کا ایک بڑا مرکز بنا دیا۔ یہاں پر احتجاجی جلسوں، جلوسوں اور گرفتاریوں کا عمل تیزی سے جاری ہوگیا۔ مولانا نے کچہری بازار کی جامع مسجد کو تحریک کا مرکز بنا دیا جہاں پر ظہر کی نماز کے بعد روزانہ احتجاجی جلسہ منعقد ہوتا اور گرفتاریاں پیش کی جاتیں تھیں۔ جوں جوں تحریک زور پکڑتی گئی تمام راہنما جیلوں میں پہنچتے گئے مگر مقامی ایکشن کمیٹی کا فیصلہ تھا کہ جیسے بھی ہو مولانا تاج محمودؒ کو گرفتاری سے بچایا جائے تاکہ تحریک کی راہنمائی اور قیادت جاری رکھ سکیں

چنانچہ پولیس نے مولانا کی گرفتاری کی کوششیں شروع کر دیں تو مولانا ہر موقع پر پولیس

---

[1] مرزا بشیر الدین محمود قادیانی خلیفہ نے مئی ۱۹۴۷ء میں کہا تھا "ہم ہندوستان کی تقسیم پر رضامند ہوئے تو خوشی سے نہیں بلکہ مجبوری سے اور پھر یہ کوشش کریں گے کہ کسی نہ کسی طرح جلد متحد ہو جائیں اور دونوں قومیں باہم شیر و شکر ہو کر رہیں۔"

روزنامہ الفضل ربوہ ۱۷ مئی ۱۹۴۷ء

کو جُل دینے میں کامیاب ہو جاتے۔ جہاں کہیں جلسہ ہوتا مولانا وقت مقررہ پر اچانک نمودار ہوتے اور مجمع سے ولولہ انگیز خطاب کرنے کے فوراً بعد پولیس اور عوام کی نظروں سے اوجھل ہو جاتے۔ یہ آنکھ مچولی کئی دن تک جاری رہی اور اس تمام عرصہ میں مولانا ہی وہ واحد شخصیت تھے جس نے پورے فیصل آباد کو کنٹرول کیا۔ یہی وہ تحریک تھی جس میں مولانا کی خوبیاں اور قائدانہ صلاحیتیں کھل کر عوام و خواص کے سامنے آئیں۔ بالآخر ایک دن پولیس اس جگہ چھاپہ مارنے میں کامیاب ہو گئی جہاں مولانا چھپے ہوئے تھے اور مولانا کو وہاں سے گرفتار کر کے شاہی قلعہ لاہور پہنچا دیا گیا۔

اس تحریک کے دوران مولانا کو بے پناہ نقصانات اٹھانا پڑے۔ ان کے گھر کا تمام اثاثہ پولیس نے ضبط کر لیا۔ اہل خانہ کا ذریعہ آمدن مولانا کی ملازمت تھی اور گرفتاری سے وہ بھی جاتی رہی نتیجتاً نوبت فاقوں تک جا پہنچی۔ مولانا کے اہل خانہ نے وہ ایک برس، جس میں مولانا جیلوں میں رہے، بڑی عسرت اور تنگ دستی بلکہ فاقہ کشی میں گزارا لیکن جب مولانا ایک سال بعد رہا ہو کر واپس آئے تو ان میں ایک نیا عزم اور حوصلہ تھا اور اس تلخ تجربے کے بعد بھی ان کے جذبات میں کمی نہ آئی تھی۔ انہوں نے زندگی کی عمارت کو از سر نو تعمیر کر کے اپنی جدوجہد کو پھر سے شروع کر دیا اور تادم آخر اسی مشن سے منسلک رہے۔

تحریکِ ختمِ نبوت ۱۹۷۴ء

۲۹ مئی ۱۹۷۴ء کو ربوہ کے ریلوے سٹیشن پر نشتر میڈیکل کالج کے طلبا کو مرزائیوں کے غنڈہ عناصر کی طرف سے شدید زدوکوب کیا گیا۔ مولانا تاج محمود پہلے شخص تھے جنہیں یہ اطلاع ملی۔ اس واقعہ کا علم ہوتے ہی مولانا مختلف اہم مقامات پر اس واقعہ کی اطلاع کرنے کے فوراً بعد ریلوے سٹیشن فیصل آباد پہنچ گئے جہاں پر ربوہ سے وہ گاڑی آ رہی تھی جس میں زخمی طلبا سوار تھے۔ مولانا کی دی ہوئی اطلاع کی وجہ سے دیکھتے ہی دیکھتے سارا شہر ریلوے سٹیشن پر اُمڈ آیا۔ زخمی طلبا کی حالت دیکھ کر مجمع بے قابو ہونے لگا تو مولانا نے ایک دیوار

پر کھڑے ہو کر کمال تدبّر کے ساتھ اس مجمع سے خطاب کیا اور مرزائیوں سے ان طلباء کے خون کے ایک ایک قطرہ کا حساب لینے کے عہد کا اعلان کرتے ہوئے اسی دن شام کو ایک مقامی ہوٹل میں پریس کانفرنس کا فیصلہ کیا۔ بعد ازاں مولانا نے شہر بھر کے ارباب حل وعقد کو اکٹھا کر کے اگلے روز فیصل آباد میں مکمل ہڑتال اور احتجاجی جلسۂ عام کا اعلان کر دیا۔ چنانچہ ۳۰ مئی کو فیصل آباد کی تاریخ میں وہ یادگار اور بے مثال ہڑتال ہوئی جس سے ۷۴ء کی تحریک تحفظِ ختم نبوت کا باقاعدہ آغاز ہوا۔

مولانا کی اطلاع پر ادھر لاہور میں شورش کاشمیری نے ۳۰ مئی کو علماء کا ایک مشترکہ اجلاس منعقد کیا۔ جس میں علماء کے سامنے یہ تجویز پیش کی گئی کہ اس مرتبہ تحریک کا رُخ حکومت کی طرف کرنے کی بجائے قادیانیوں کی طرف کر دیا جائے۔ جسے علماء نے تسلیم کر لیا اور بعد میں اسی تجویز پر عمل ہوا۔

اسی نوعیت کا ایک اجلاس راولپنڈی میں بھی ہوا اور اس طرح ملک گیر احتجاجی جلسوں کا سلسلہ چل نکلا۔ اس احتجاج سے متاثر ہو کر اس وقت کی حکومت پنجاب نے ۳۱ مئی کو لاہور ہائی کورٹ کے چیف جسٹس مسٹر کے ایم۔ اے صمدانی کی قیادت میں ایک تحقیقاتی عدالتی کمیشن قائم کیا جسے جلد از جلد واقعہ ربوہ کی تحقیقاتی رپورٹ پیش کرنے کا حکم دیا گیا۔

ادھر مولانا تاج محمود اور مولانا محمد یوسف بنوریؒ (جو اس وقت مجلس تحفظِ ختم نبوت کے امیر تھے) نے باہمی طور پر یہ طے کر لیا کہ واقعہ ربوہ سے پیدا ہونے والی بے چینی کو اس طرح منظم کیا جائے کہ صرف واقعہ ربوہ کے مجرمان کی گرفتاری ہی نہ ہو بلکہ مسلمانان پاکستان کا دیرینہ مطالبہ کہ قادیانیوں کو آئینی طور غیر مسلم اقلیت قرار دیا جائے، بھی تسلیم کر لیا جائے۔

۳۰ مئی کو مولانا تاج محمود کی دعوت و تحریک پر تمام دینی اور قومی جماعتوں کا ایک مشترکہ اجلاس جامع مسجد کچہری بازار فیصل آباد میں منعقد ہوا۔ اس اجلاس سے خطاب کے دوران مولانا نے ڈنکے کی چوٹ پر یہ اعلان کر دیا کہ اب ہم مرزائیوں کو آئینی طور پر غیر مسلم اقلیت

قرارداد لواکر ہی دم لیں گے۔

اس کے بعد تمام دینی و سیاسی جماعتوں کا ایک مشترکہ اجلاس راولپنڈی میں منعقد ہونا طے پایا۔ اب انتظامیہ اس تحریک میں مولانا تاج محمود کے کردار اور ان کی اہمیت سے بخوبی واقف ہو گئی تھی چنانچہ مولانا جب چناب ایکسپریس کے ذریعہ فیصل آباد سے راولپنڈی جا رہے تھے تو مولانا کو ان کے رفقاء سفر سمیت راستہ میں ہی گرفتار کر کے تھانہ ڈنگہ میں قید کر دیا گیا اور جب میٹنگ کا وقت ختم ہو گیا تو رات گئے آپ کو رہا کر دیا گیا نتیجتہً اس میٹنگ میں ۹ جون کو دوبارہ لاہور میں میٹنگ رکھنے کا فیصلہ کر کے اجلاس برخاست کر دیا گیا۔

لاہور میں ۱۸ دینی و سیاسی جماعتوں کے نمائندگان پر مشتمل میٹنگ میں قادیانیوں کے اقتصادی و عوامی بائیکاٹ کا فیصلہ کیا گیا اور مجلس عمل تشکیل دی گئی اور مجلس عمل کے مستقل انتخاب کے لئے ۱۶ جون کی تاریخ مقرر کی گئی اور مولانا تاج محمود کے احترام اور فیصل آباد کے عوام کے جذبے کے پیش نظر یہ تاریخی میٹنگ فیصل آباد میں منعقد کی گئی

مولانا محمد یوسف بنوری نے اپنے معتمد رفیق کار مولانا تاج محمود کو تمام تحریک کے دوران ہر مرحلہ پر اپنے مشوروں اور فیصلوں میں شامل رکھا اور جب حکومت سے مجلس عمل کے مذاکرات کا مرحلہ پیش آیا تو مولانا بنوری نے مولانا تاج محمود کو صلاح و مشورہ کے لئے فوراً اسلام آباد طلب کر لیا۔ مولانا تاج محمود اسلام آباد جاتے ہوئے فیصل آباد میں ایک نگران کمیٹی تشکیل دے گئے تاکہ اگر تحریک کو تشدد کی راہ پر ڈال دیا جائے تو یہ کمیٹی حالات کو قابو میں رکھے۔

جب پارلیمانی سطح پر اکابرین کی کوششیں عروج پر تھیں اس وقت بھی مولانا نہایت تندہی کے ساتھ سرگرم عمل تھے۔ ایک روایت کے مطابق جب اس مسئلہ پر غور کرنے کے لئے قومی اسمبلی کا خصوصی اجلاس ہو رہا تھا تو اس دوران مولانا اسمبلی ہال سے باہر ایک کمرہ میں بے شمار کتب اور حوالہ کی کتابوں کے ساتھ بیٹھے رہتے تھے۔ اندر بحث کے دوران علماء اور حکومت کے سرکاری کارندوں کو جب بھی کسی حوالہ یا دینی سند کی ضرورت پڑتی

تو مولانا تاج محمودؒ چند لمحوں میں وہ کتاب اور حوالہ نکال کر اس پر چٹ لگاتے اور کتاب اندر بھجوا دیتے تھے ۔ ؎

مرزا ناصر احمد پر قومی اسمبلی میں کئی روز تک جرح اور صمدانی ٹربیونل کی رپورٹ کے بعد جب قادیانیت کے بارے میں اصل حقائق اور عوام کے جذبات و مطالبات نکھر کر حکومت کے سامنے آگئے تو بالآخر ، ستمبر ۷۴ء کو آئین میں ترمیم کے ذریعے قادیانیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دینے کا اعلان کر دیا گیا ۔ یہ فیصلہ درحقیقت ملک کے تمام طبقہ ہائے فکر کے افراد کی مسلسل جدوجہد ، عشقِ رسولؐ اور عوام کے جذبہ ایمانی ان شہداء و مجاہدین کی مقدس ارواح کے اخلاص کا نتیجہ تھا جنہوں نے تحفظِ ناموسِ رسالت کے لئے اپنی جانوں کی بازیاں لگا دیں تھیں ۔

مولانا تاج محمودؒ ۱۹۷۴ء کی اس تحریک کی نیو اٹھانے والے راہنما تھے ۔ آپ نے اس تحریک کے لئے بے مثال قائدانہ کردار ادا کیا اور تحریک کی کامیابی کے لئے سر دھڑ کی بازی لگا کر اسے کامیابی سے ہمکنار کیا ۔ مولانا کے اسی شاندار کردار کی بدولت لاہور میں یکم ستمبر ۷۴ء کو منعقد ہونے والی آل پارٹیز میٹنگ میں علامہ محمود احمد رضوی نے مولانا تاج محمودؒ کو بابائے تحریک ختم نبوت کا خطاب دیا ۔

اسی طرح مولانا نے ۷۷ء میں چلنے والی تحریک نظامِ مصطفیٰؐ میں بھی سرگرم حصہ لیا اور فیصل آباد کے محاذ پر علماء کے درمیان رابطہ کے فرائض نہایت احسن طریقہ سے سرانجام دیئے ہر چند کہ اس وقت مولانا ضعیف اور کمزور ہو چکے تھے مگر اسلامی نظامِ حکومت کے قیام کے مقصدِ عزیز کی خاطر وہ اس وقت بھی اپنی رگوں میں جوان خون گردش کرتا محسوس کرتے تھے ۔

خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را

؎ ہفت روزہ "چٹان" لاہور ۔ ۲۳ تا ۳۰ جنوری ۱۹۸۴ء

قیدوبند

مولانا کی پہلی گرفتاری ۱۹۵۲ء میں اس وقت عمل میں آئی جب شہر لائل پور میں قادیانی حضرات نے اپنے دل آزار عقائد کی تبلیغ کے لیے ایک جلسہ عام کے انعقاد کا اہتمام کیا۔ کوشش کے باوجود جب اس جلسہ کا انعقاد نہ رک سکا تو مولانا نے قادیانی حضرات کی جلسہ گاہ کے قریب ہی مسلمانوں کے جلسہ عام کا اہتمام کر ڈالا۔ جب بیک وقت دونوں جلسے شروع ہوئے تو عوام میں تصادم شروع ہو گیا۔ جس کے نتیجے میں گرفتاریاں عمل میں آئیں اور اس سلسلہ میں مولانا تاج محمود کو چھ ماہ کے لئے نذرِ زنداں کر دیا گیا۔

دوسری گرفتاری ۱۹۵۳ء کی تحریک ختم نبوت میں سرگرم حصہ لینے اور اس سلسلے پر پورے شہر کو ابھارنے اور قیادت کرنے کے "جرم" کی پاداش میں ۲۰ مارچ ۱۹۵۳ء کو سیفٹی ایکٹ ۱۹۴۹ء کے تحت عمل میں آئی اور گرفتاری کے بعد مولانا کو شاہی قلعہ لاہور میں بند کر دیا گیا۔ پھر کچھ دن بعد مولانا کی قید میں ۱۹ ستمبر ۱۹۵۳ء تک کے لئے توسیع کر دی گئی اور پھر ۴ اپریل ۱۹۵۳ء کو قلعہ سے نکال کر پنجاب کی کسی بھی جیل میں لے جانے کے احکامات صادر ہوئے۔ چنانچہ پنجاب گورنمنٹ کی طرف سے ۸ ستمبر ۱۹۵۳ء کو مولانا کو کیمبل پور ڈسٹرکٹ جیل پہنچا دیا گیا جہاں آپ کی قید کی میعاد ۱۸ مارچ ۱۹۵۴ء تک بڑھا دی گئی اور اسی تاریخ کو کیمبل پور ڈسٹرکٹ جیل سے آپ کی رہائی عمل میں آئی۔

تیسری گرفتاری تحریک ختم نبوت ۱۹۷۴ء کے دوران عمل میں آئی جب مولانا مجلس عمل تحفظ ختم نبوت کے اجلاس میں شرکت کے لئے لائل پور سے راولپنڈی جا رہے تھے۔ انتظامیہ اس تحریک میں مولانا کے اہم ترین رول کو خوب سمجھتی تھی اور اسے معلوم تھا کہ مولانا کی عدم شرکت سے راولپنڈی کی میٹنگ کو غیر موثر بنایا جا سکتا ہے چنانچہ راولپنڈی جاتے ہوئے ابھی مولانا اپنے ساتھیوں سمیت ڈونگہ تک ہی پہنچے تھے کہ آپ کو مع ہمراہیوں کے گرفتار

کرلیا گیا اور سیٹنگ کا وقت ختم ہونے کے بعد رہا کر دیا گیا۔

قلم و قرطاس سے تعلق

مولانا کا شمار جہاں برصغیر میں عوامی خطباء کے سب سے بڑے گروہ مجلس احرار اسلام میں ہوتا ہے۔ وہاں ان میں مبدء فیاض نے تحریر کی صلاحیت بھی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ وہ اپنے جذبات و کیفیات کو کماحقہٗ سینۂ قرطاس پر منتقل کر دینے پر قادر تھے۔

انہوں نے ۱۹۶۴ء میں فیصل آباد سے ایک دینی ہفت روزہ "لولاک" جاری کیا اور اپنی وفات تک مسلسل بیس برس اس کے اداریے سپرد قلم کرتے رہے۔ پیشتر ازیں وہ مولانا مجاہد الحسینی صاحب کے ہمراہ روزنامہ آزاد لاہور کے شریک مدیر بھی رہ چکے تھے۔ "لولاک" کی تحریروں کے ذریعے مولانا نے نہ صرف یہ کہ تحفظ ختم نبوت اور دیگر دینی اور ملی مسائل کے بارے میں گرانقدر خدمات سرانجام دیں بلکہ انہوں نے مسلسل بیس برس تک اردو صحافت کے چمن کی آب یاری بھی کی قادیانیت کے متعلق چند وقیع کتابچے اور قیام پاکستان سے قبل و مابعد کے اخبارات میں لکھے جانے والے مضامین۔ اس کے علاوہ ہیں۔

اپنے طبقہ کے علماء میں مولانا ان معدودے چند افراد میں سے تھے جنہیں فی زمانہ قلم و قرطاس کی اہمیت کا اندازہ تھا۔ وہ جانتے تھے کہ تقریر کی نسبت تحریر کا اثر زیادہ دیرپا ثابت ہوتا ہے اور اس کا حلقہ خطاب بھی تقریر سے کہیں زیادہ وسیع ہوتا ہے۔ یہ سوچ اور اس پر عمل بھی مولانا کو اپنے بہت سے معاصرین سے ممیز کرتا ہے۔

مولانا کے قلم میں چاشنی اور روانی تھی بیشتر فقرے سہل ممتنع کا درجہ رکھتے تھے انہیں لکھنے کے لئے کسی خاص ماحول اور کیفیت کی ضرورت نہ ہوتی تھی جس حالت میں بھی ہوتے لکھ لیتے۔ بارہا ایسا دیکھنے میں آیا کہ مولانا دوستوں سے گفتگو بھی کر رہے ہیں

اور لولاک کا اداریہ بھی سپردِ قلم ہو رہا ہے۔
بہر حال یہ ایک حقیقت ہے کہ مولانا اپنی دوسری تنظیمی اور سماجی مصروفیات کے باعث اس طرف کامل توجہ نہ دے سکے۔ اگر انہیں اس طرف مکمل توجہ منعطف کرنے کا وقت ملتا تو وہ بعض اچھی تصانیف بھی اپنی یادگار چھوڑ جاتے۔

گھر کی بات

مولانا کی ازدواجی زندگی کا آغاز ۱۹ء میں ہوا آپ نے ایک شادی کی۔ آپ کے ہاں دو بیٹے اور چار بیٹیاں پیدا ہوئیں۔ پہلا بیٹا جس کا نام عبدالمالک تھا سات سال کی عمر میں وفات پا گیا جب کہ دوسرے بیٹے کا نام طارق محمود ہے جو بفضلہٖ تعالیٰ کارگاہِ حیات میں بطریقِ احسن سرگرمِ عمل ہیں۔
طارق محمود صاحب اپنے والد کے خلوص کی تصویر ہیں اور مولانا کی وفات کے بعد سے اب تک ان کے مقدس مشن کو سنبھالے ہوئے ہیں۔ آج کل "لولاک" کے چیف ایڈیٹر ہیں اور مختلف مذہبی اور ملی اجتماعات میں تقریریں بھی کرتے ہیں۔
مولانا کی ساری اولاد پڑھی لکھی اور باشعور ہے۔ مولانا کی صاحبزادیاں بھی اپنے والد کے قائم کردہ ایک مدرسہ " مدرسۃ البنات " میں معلمی کے فرائض سرانجام دیتی ہیں۔ مولانا کی اہلیہ نہایت باوقار اور نیک خاتون خانہ ہیں۔ تمام عمر شوہر کی اطاعت و فرمانبرداری میں گزاری نہایت متقی اور پرہیزگار خاتون ہیں۔ اللہ تعالیٰ انہیں طویل عمر عطا فرمائے۔ آمین۔

وفات

۲۰ جنوری ۱۹۸۴ء کو علی الصبح طبیعت میں خرابی کے آثار نمودار ہوئے تو مولانا کے صاحبزادے نے ڈاکٹر کو بلانا چاہا جس پر مولانا نے یہ کہہ کر منع کر دیا کہ

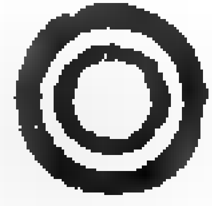
اُب ڈاکٹر کو بلانے کا وقت نہیں ہے۔ لیکن ڈاکٹر صاحب کو بلا لیا گیا۔ انہوں نے مولانا کا معائنہ کیا اور فوراً ہسپتال پہنچانے کے لئے کہا۔

ہسپتال روانہ ہونے سے پہلے مولانا نے اپنی بیٹی سے آب زم زم مانگا اور کھڑے ہو کر آب زم زم پینے کے بعد گھر سے روانہ ہو لئے۔ دروازے تک پہنچ کر رک گئے اور باآواز بلند کلمہ شہادت پڑھا پھر فرمایا "اچھا اللہ! میرا یہ بھولا بھالا گھرانہ تیرے حوالے"

ہسپتال پہنچنے کے فوراً بعد نظام تنفس کو بحال رکھنے کے لئے آکسیجن لگا دی گئی۔ مگر چند گھنٹوں کے بعد سر کو دائیں جانب کر کے تین بار کسی کو آنے کا اشارہ کیا اور کلمہ شریف پڑھتے ہوئے جان جان آفریں کے سپرد کر دی۔

اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔

شخصیّت



چہ باید مرد را طبع بلندے مشرب نابے
دل گرمے نگاہِ پاکبینے جان بیتابے



زندگی کی رونقیں جس شخص سے منسوب تھیں
چھین لے گی موت اس کو یہ کبھی سوچا نہ تھا

یونس خیال

شخصیت

عشقِ رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم

جب بھی مولانا تاج محمودؒ کی شخصیت کا تجزیہ کیا جائے گا اس میں ان کے جذبہ عشقِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر سب سے پہلے ہوگا کیوں کہ یہی وہ خصوصیت ہے جس سے مولانا کی ساری شخصیت عبارت تھی۔ ان کی تمام تر زندگی کا حاصل جذبہ عشق رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہی تھا وہ خود بھی اس دولت کو اپنا سرمایہ حیات گردانتے اور اس میں ڈوبے جاتے تھے۔ ان کی ساری زندگی جس مشن کے لئے وقف رہی اور جس پر ان کی تمام صلاحیتیں صرف ہوئیں وہ خود ان کے عشق رسالتمآب کا منہ بولتا ثبوت ہے۔

انسان اپنے جذبات کو جو پردوں میں بھی چھپانا چاہے۔ اس کی آنکھیں اس عمل میں اس کی معاونت نہیں کرتیں بلکہ آنکھیں ہی انسان کی قلبی کیفیات کی غمازی کرتی ہیں ہم نے بارہا ایسا دیکھا کہ جب بھی کسی مجلس میں خاتم المرسلین، رحمۃ للعالمین حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر مبارک آیا تو مولانا کی آواز کانپنے لگی اور آنکھوں سے آنسو چھلکنا شروع ہو جاتے۔ اگر کبھی کسی دریدہ دہن شخص کی کوئی ایسی تحریر سامنے آجاتی جس سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم (فداہ ابی وامی) کی معاذاللہ توہین کا پہلو نکلتا تو مولانا بے چین و مضطرب ہو جاتے اور اس روز تمام دن کی گفتگو میں حضور اکرم کا ہی بات طیبہ کا ہی موضوع زیر بحث رہتا۔

مولانا کی ساری زندگی اور تمام تر توانائیاں ایک اسی مقدس جذبہ کے تحت صرف ہوئیں انہوں نے جس انداز سے قادیانیت کا تعاقب و احتساب کیا وہ نہ صرف یہ کہ انہی کا حصہ تھا بلکہ یہی عشق

رسولؐ تھا جو ان کی رگ و پے میں سما چکا تھا۔ مولانا کی شخصیت میں اس جذبۂ صادق کا اس قدر دخل ہے
کہ عشقِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر کئے بغیر ان کا تعارف کرایا ہی نہیں جا سکتا۔

اصحابؓ رسولؐ سے محبت

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے
"جس نے میرے اصحابؓ سے محبت کی اس نے مجھ سے محبت کی" ۔ مولانا اس ارشاد نبوی کی عملی تفسیر تھے ۔ وہ عشقِ رسولؐ کے ساتھ اصحابِ رسولؐ اور اہل بیت اطہار (آل بیت کے لئے یہی اصطلاح استعمال کرتے تھے) سے بھی بے پناہ عقیدت و محبت رکھتے تھے۔ اصحابؓ رسولؐ سے ان کی محبت کا اندازہ صرف اسی ایک واقعہ سے کیا جا سکتا ہے کہ ایک بار میں نے ان سے ایک طالب علمانہ سوال کیا کہ مولانا! .... "خلافت و ملوکیت" میں صحابہ کرامؓ سے متعلق بد قابل اعتراض باتیں لکھی گئی ہیں، ان کا بیشتر حصہ تاریخ کی قدیم کتب سے ماخوذ ہے لیکن جب ہم خلافت و ملوکیت کا تجزیہ کرتے ہیں تو ان باتوں کے بیان پر مولانا مودودی مرحوم کو ہی کیوں مورد الزام ٹھہراتے ہیں؟ ان تاریخ دانوں کے بارے میں کیوں کچھ نہیں کہتے جنہوں نے ان باتوں کو تاریخ کے اوراق میں جگہ دے کر آئندہ تشکیک کے دروازے کھولے؟

میرے اس سوال کو مولانا نے بڑے غور سے سنا اور اس کا ایک مختصر جواب دیتے ہوئے فرمایا ......" بیٹا! بات یہ ہے کہ آپ کا ایمان قرآن پر ہے یا تاریخ پر؟ پھر جب قرآن نے صحابہؓ کے بارے میں فرما دیا کہ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوا عَنْهُ ۔ اس کے بعد آپ تاریخ کے بیانات کو کس درجہ میں رکھیں گے؟ یہ آپ پر منحصر ہے"۔

مولانا کے اس جواب سے ان کی صحابہ کرام سے محبت کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

توکل علی اللہ

خالقِ ارض و سما پر غیر متزلزل ایمان اور رسول اکرمؐ اور صحابہؓ سے بے پناہ

محبت کے جذبات نے مولانا میں توکّل علی اللہ کی اعلیٰ صفت بھی پیدا کردی تھی۔ دنیاوی مال و متاع ان کے لیے چنداں اہمیت نہ رکھتے تھے۔ ان کے روزمرہ کے معمولات توکل علی اللہ کا بھرپور مظاہرہ ہوتے تھے۔ مولانا کی مجلسوں میں بیٹھنے والے افراد ان کے توکّل کے واقعات سے بخوبی آگاہ ہوں گے۔ مجھے کسی حد تک مولانا کی نجی زندگی کے مطالعہ کا بھی موقع ملا اور اس میں بھی مجھے مولانا کے توکّل کا وہی انداز نظر آیا جو اُن کی سماجی زندگی میں تھا۔ وہ پیسے کو جوڑ جوڑ کر رکھنے کے عادی نہ تھے۔ جو آتا اسے خرچ کر دیتے یا اس کا معتدبہ حصہ راہِ خدا میں دے دیتے۔ بہت اہم اور ضروری حسابات ایک کاپی میں درج کر لیتے ورنہ اکثر "ایک ہاتھ آیا اور دوسرے ہاتھ سے چلا گیا" کی کیفیت رہتی تھی۔

ایک بار ایک وفاقی وزیر نے، جو کسی زمانہ میں مولانا کے نیازمند اور واقف حال تھے، اپنی وزارت کے دور میں مولانا کی کوئی "خدمت" کرنا چاہی مگر مولانا کی خودداری اور توکّل نے کمال استغنا اور درویشی کے ساتھ ان وزیر صاحب کی پرخلوص پیش کش کو یہ کہہ کر شکریہ کے ساتھ قبول کرنے سے انکار کر دیا کہ "مجھے میرے رب نے جو کچھ دیا ہے وہ میرے لئے کافی ہے"۔ اور یہ ایسا موقع تھا کہ جہاں وزیر موصوف کے شکریے کے ساتھ ان کی پیش کش کو قبول کیا جا سکتا تھا مگر یہ مولانا کا کمال تھا کہ وہ ایسے مواقع سے اسی طرح عہدہ برآ ہوتے تھے جیسے کہ ایک صحیح متوکل شخص کو ہونا چاہیے۔ البتہ باطل قوتوں کے مقابلہ کے مسئلے پر ان کا توکّل مولانا ظفر علی خاںؒ کے اس شعر کی تفسیر تھا۔

؎ توکّل کا یہ مطلب ہے کہ خنجر تیز رکھ اپنا
پھر انجام اس کی تیزی کا مقدر کے حوالے کر

درویش منش

مولانا تاج محمودؒ بنیادی طور پر ایک قلندر مزاج انسان تھے جب کبھی موڈ میں ہوتے تو خود فرمایا کرتے تھے کہ "میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے رندانہ طبیعت لے کر پیدا ہوا ہوں" اور حقیقت یہ ہے کہ ان کا رہن سہن، افتاد طبع، انداز اور طور طریقے سب قلندرانہ تھے اور

یہی قلندری تھی جس کی بنا پر انہوں نے خود ساختہ پابندیوں اور ضابطوں کی قیود سے آزاد ہو کر زندگی گزاری۔ ان کے پاس آنے اور ملنے والوں پر بھی پابندیاں اور ضابطے عائد نہ ہوتے تھے بلکہ جو کوئی آتا اور جب آتا ان کی مجلس میں شامل ہو جاتا۔ اپنے مسائل حل کرواتا اور بلا خوف و بے دھڑک اپنے دل کی کہہ بھی لیتا تھا اور اس محفل میں جرأت گفتار کا یہ مظاہرہ کچھ عجیب بھی نہ لگتا تھا کہ وہاں روز مرہ کا معمول یہی تھا۔

مولانا کی زندگی کا یہ پہلو دلچسپ اور مفید بھی تھا کہ ہر طبقۂ زندگی کے لوگ ان کے پاس آتے اور اپنے اپنے انداز میں اپنا مدعا بیان کرتے۔ مولانا ہر ممکن طریقے سے ان کے مسائل حل کرانے کی بھی سعی کرتے۔ ایک ریڑھی والے سے لے کر ملک نیجر تک یا ایک چوکیدار سے لے کر قومی رہنماؤں تک سب ان کی بیٹھک میں بیٹھتے اور مولانا ان کے مسائل حل بھی کیا کرتے تھے۔ ان کی سنتے، اپنی سناتے اور باہم مشاورت کے امور بھی یہیں انجام پاتے تھے۔

بڑوں کی عزّت اور چھوٹوں پر شفقت

قدرت نے بڑوں کی عزت کرنے اور چھوٹوں پر شفقت فرمانے کا وصف مولانا میں کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا اور اسی وجہ سے مولانا سے تعلق رکھنے والے تمام بڑے اور چھوٹے انہیں دل کی انتہا گہرائیوں سے چاہتے تھے۔ مولانا کو اپنی زندگی میں بے شمار بڑے آدمیوں کے ساتھ کام کرنے کا موقع ملا۔ مولانا خود ایک بڑے آدمی تھے وہ بڑے لوگوں کے اوصاف و عادات سے بھی واقف تھے مگر پھر بھی وہ انکا خاص خیال رکھا کرتے تھے۔ جب کوئی بزرگ تشریف لاتے تو مولانا اپنی طرف سے ان کی عزت و تکریم میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کرتے۔ ہم نے خود بارہا دیکھا کہ جب کبھی ہمارے سامنے کوئی بزرگ تشریف لاتے تو مولانا انکی عزت فرمانے کے خیال سے بے چین رہتے اور اپنی عام روٹین کے خلاف اس روز لیٹنے کی بجائے بیٹھے رہتے یا ادھر ادھر کام کرتے پھرتے اور ہر طرح سے

خیال رکھتے کہ کسی طرح بھی اُن کے احترام میں فرق نہ آنے پائے۔

رہا چھوٹوں کا معاملہ تو اس بارے میں ہر کوئی جانتا ہے کہ کوئی زمانہ مولانا ان محمود مرحوم سے زیادہ چھوٹوں پر شفقت اور ان کی حوصلہ افزائی کرنے والا کوئی نہ تھا معصوم بچوں سے ان کا پیار دیدنی ہوتا اور بچوں سے بھی ان کا پیار رشتوں اور تعلقات تک محدود نہ تھا بلکہ انہیں ہر نظر آنے والا بچہ پیارا لگتا اور وہ اس کے لئے دعا گو ہوتے تھے۔

ایک بار میں اور مولانا شادی کی ایک تقریب میں گئے۔ وہاں تقریب نکاح سے کچھ پہلے دو چھوٹے چھوٹے معصوم بچے ہمارے آس پاس دوسرے بچوں کے ساتھ کھیل رہے تھے اور ہم نکاح کی تقریب کے منتظر تھے کھیل کے دوران ہم چونک گئے جب وہ دونوں بچے جو نہایت خوش شکل اور خوش ادا تھے، ایک دوسرے کے ساتھ اشاروں سے گفتگو کرنے لگے۔ اس پر ہمارے ساتھ بیٹھے ایک صاحب نے بتایا کہ یہ بچے قوت گویائی سے محروم ہیں۔ یہ سن کر بے اختیار مولانا کا دل بھر آیا اور ان کی آواز بھرا گئی۔ مولانا نے ان دونوں بچوں کو پاس بلا کر ان کے سر پر ہاتھ پھیرا اور انہیں پیار کیا اور مجھ سے مخاطب ہو کر کہنے لگے "اللہ کی شان کہ اس نے ان بچوں کو کیسی پیاری صورتیں عطا کیں ہیں مگر قوتِ گویائی چھین لی۔" ان الفاظ کی ادائیگی کے وقت مولانا کا لہجہ ان کے دل میں پیدا ہونے والی آزردگی کا صاف پتہ دے رہا تھا۔ خود مولانا کے گھر میں جب کوئی بچہ ضد کرتا تو مولانا اس کی ضد کو رد نہ کر سکتے تھے کیونکہ وہ اپنی طبیعت سے مجبور تھے۔

علاوہ ازیں، نوجوان طبقہ جس طرح مولانا کا والا و شیدا تھا اس کی بنیادی وجہ یہی تھی کہ مولانا ہر نوجوان سے اپنے بیٹوں کا سا سلوک کرتے۔ گھر پر آنے والے ہر شخص سے ان کا سلوک اس طرح ہوتا کہ جیسے بس دنیا میں مولانا کو ایک اسی شخص سے ہی تعلق ہے۔ قیام و طعام سے لے کر آنے والے کے مسائل کے حل تک میں مولانا گہری دلچسپی کا مظاہرہ کرتے اور اسے وہ خلوص پیش کرتے جو آنے والے کے لئے زندگی بھر کی متاع بے بہا بن جاتا۔

اپنے مہمانوں کی تواضع کے لئے مولانا سے جو کچھ بن پڑتا وہ اس سے دریغ نہ کرتے لیکن مہمان

مولانا کے کھانوں سے زیادہ مولانا کی ذات سے محبت کرنیوالے ہو جاتے تھے اس لئے انہیں مولانا کے گھر کی دال روٹی دعوت شیراز سے کم نہ معلوم ہوتی۔

ان سب کچھ کے باوجود مولانا کا یہ وصف خاص تھا کہ وہ اپنے ملنے والوں پر اپنی بڑائی کا رعب نہیں جمایا کرتے تھے بلکہ وہ چھوٹوں کی صلاحیتوں کو اجاگر کر کے انہیں بڑا بنا دینے کے فن میں ماہر تھے۔

حوصلہ افزائی ایک ایسا جوہر ہے جو چھوٹوں کو آگے بڑھنے کے لئے مشعل راہ کا کام دیتا ہے اور مولانا کے ہاں یہ جوہر انتہائی وافر مقدار میں پایا جاتا تھا۔ بھلائی کے کسی بھی شعبہ سے تعلق رکھنے والے افراد مولانا سے اپنی تعریف کے کلمات سن کر خوشی سے پھولے نہ سماتے اور اس سے انہیں اپنے اپنے میدان میں آگے بڑھنے کے لئے ایک ولولۂ تازہ عطا ہوتا تھا۔

علم دوستی و مطالعہ

علم دوستی بھی مولانا کی شخصیت کا ایک خاص پہلو تھا۔ مولانا خود سمندر علم کے شناور تھے اور اہل علم سے قریبی تعلق کے باعث ان میں اس سمندر کی غواصی کا جذبہ مزید ابھر کر سامنے آیا تھا۔ مولانا کو بیک وقت اردو، عربی اور فارسی پر عبور حاصل تھا عربی اور فارسی ادب کے مطالعہ کا شوق بالخصوص مولانا میں کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ ہر چند کہ آخری عمر میں صحت کی خرابی اور دوسرے ہنگاموں کے باعث مولانا کے مطالعہ کا سلسلہ جاری نہ رہ سکا مگر ان کی گفتگو اور طرز تکلم سے صاف عیاں ہوتا تھا کہ مولانا کے ذہن میں اردو فارسی ادبیات سے متعلق ایک اچھی خاصی لائبریری اتری ہوئی ہے۔ یہ اسی علم دوستی اور مطالعہ کا فیضان تھا کہ تحریک ختم نبوت ۱۹۵۲ء میں جب مولانا شاہی قلعہ لاہور کی سزا کاٹ کر واپس آئے اور جب مولانا کے گھر کا اثاثہ پولیس اور انتظامیہ کے ہاتھوں تباہ و برباد ہو چکا تھا اور ان کے گھر میں فاقوں کی نوبت آئی ہوئی تھی تو مولانا نے بجائے کوئی اور کاروبار کرنے کے ایک ایسا ادارہ قائم کیا جس سے نہ صرف مولانا کی گذران

ہونے لگی بلکہ وہاں علم کے پیاسے بھی سیراب ہونے لگے۔ میری مراد مولانا کے قائم کردہ "اردو فارسی کالج" سے ہے جس میں ڈاکٹر صدیق خان شبلی جیسے لائق اساتذہ (جو آج کل مغربی جرمنی کے مطالعاتی دورہ سے واپسی پر علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی اسلام آباد میں صدر شعبہ اردو کے منصب پر فائز ہیں) مولانا کی سرپرستی میں درس و تدریس کے فرائض سرانجام دیا کرتے تھے۔

مولانا کی ایک ذاتی لائبریری بھی تھی جس میں مولانا نے تمام کتابوں کو نہایت سلیقہ کے ساتھ ترتیب وار رکھا ہوا تھا اس لائبریری میں اسلامیات، ادب، صحافت، شاعری، معاشیات، تاریخ اور دیگر موضوعات پر کافی کتابیں موجود تھیں مگر جب مولانا کی صحت گرنے لگی تو بعض احباب کی کرمفرمائیوں کے باعث یہ لائبریری بھی بکھر گئی اور اب اس میں سے صرف ایک الماری باقی رہ گئی ہے جس میں چند منتشر کتابیں پڑی ہیں۔

مولانا آخری دنوں میں ازراہ مذاق کہا کرتے تھے کہ میرے پاس شورش کاشمیری مرحوم کی ایک نشانی رہ گئی ہے اور وہ شورش مرحوم کی ایک کتاب "یورپ میں چار ہفتے" کی جلد کا گتہ تھا جو کسی طرح مولانا کی الماری میں پڑا رہ گیا تھا۔ شورش کی باقی کتابیں بھی بعض پڑھنے والے لے گئے اور پھر کبھی واپسی کی نوبت نہ آئی۔ کس طرح "تماشا" ہے "یورپ میں چار ہفتے" کی جلد کا گتہ وہاں رہ گیا تھا۔ جب بھی مولانا کو نظر آتا یہی بات کہا کرتے تھے۔

مولانا کی جب اہل علم کے ساتھ محفل جمتی تو وہاں پر دنیا بھر کے علمی موضوعات پر گفتگو ہوتی۔ ادب کا ذکر آتا تو اس کے نئے نئے گوشے نمودار ہونے لگتے۔ سیاسیات کا تذکرہ ہوتا تو مولانا کی گل افشانی گفتار اس پر بھی اپنا رنگ دکھاتی۔ غرضیکہ دنیا بھر کے موضوعات پر مولانا کمال وسعت اور معلومات کے ساتھ گفتگو کیا کرتے تھے جو ان کے وسیع مطالعے اور ذاتی تجربے کا نتیجہ تھا۔

شعراء میں نظیری اور غالب ان کے پسندیدہ شاعر تھے۔ نظیری کے سینکڑوں اشعار مولانا کو نوک زبان رہتے اور موقع محل کے مطابق مولانا اشعار اس طرح پڑھتے کہ سننے والا پھڑک اٹھتا

تھا خطوط میں بھی جابجا اشعار استعمال کرتے تھے۔

غالب کے متعلق فرماتے کہ اردو دان لوگ غالب سے واقف ہی نہیں ہیں کیونکہ جو غالب اردو میں آپ کو نظر آتا ہے وہ اصل میں غالب کی محض ایک جھلک ہے۔ اصل غالب تو وہ ہے جو اس کی فارسی شاعری میں نظر آتا ہے۔ غالب کے اشعار پڑھتے اور سر دھنتے تھے۔

میں نے ایک بار مولانا کو غالب، نظیری اور اردو فارسی کے دیگر شعراء کے منتخب اشعار پر مشتمل صوفی غلام مصطفےٰ تبسم کی کتاب "یک ہزار و یک سخن" تحفہ میں دی۔ مولانا اس کتاب سے بہت مسرور اور خوش ہوئے اور فرمانے لگے کہ زاہد! تم تو بالکل میری پسند کی چیز لائے ہو۔ اس کتاب کو سرہانے رکھ لیا اور اسے بڑے شوق سے مطالعہ کر رہے تھے کہ دو چار روز بعد کسی شخص نے اسے وہاں سے اٹھا لیا اور بعد ازاں مولانا نے بار بار اپنی گفتگو میں مجھ سے اس کتاب کے گم ہو جانے پر افسوس کا اظہار کیا۔ افسوس کی بات یہ کہ مجھے وہ کتاب دوبارہ بازار میں نظر نہ آئی ورنہ میں مولانا کو دوبارہ پیش کرتا اور شاید یہ پہلا اور آخری تحفہ تھا جو میں نے مولانا کی خدمت میں پیش کیا۔ یا پھر میں نے مولانا کی زندگی میں ان کے کردار سے متاثر ہو کر ان کے بارے میں ایک نظم لکھی جسے مولانا نے اشاعت سے رکوا دیا تھا اور فرمایا تھا کہ مجھے یہ پسند نہیں کہ میری زندگی میں میری تعریف چھپے۔

مجلس آرائی و زندہ دلی

مولانا اپنی بے شمار دیگر خوبیوں کی طرح ایک کامیاب مجلس آرا انسان تھے۔ دورِ حاضر میں مادیت پرستی نے جن پرانی قدروں کو ملیا میٹ کر کے رکھ دیا ہے مجلس آرائی بھی ان میں سے ایک ہے۔ ایک زمانہ تھا کہ پڑھے لکھے لوگ دن بھر کے کام کاج سے فارغ ہو کر شام کو کسی دوست کی بیٹھک میں بیٹھ کر مختلف موضوعات پر گفتگو کرتے ایک دوسرے کے مسائل پر بحث ہوتی۔ کائنات کے مظاہر پر غور کیا جاتا اور ہر شخص دوسرے کے

دکھ درد کو بانٹنے کی کوشش کرتا مگر مشینی دور نے انسان کو اس قدر مصروف کر دیا ہے کہ اب اس کے پاس مجلس آرائی تو کیا کسی مجلس میں شرکت یا کسی کی خیریت دریافت کرنے کا بھی وقت نہیں رہا۔ پرانے وقتوں کے کچھ لوگوں سے قائم یہ روایت ان لوگوں کے آہستہ آہستہ اٹھتے رہنے کے باعث اب دم توڑ رہی ہے۔

مولانا کا تعلق بھی چونکہ اس نسل سے تھا جو اب قریب الختم ہے اس لئے مولانا میں بھی یہ وصف بطور خاص پایا جاتا تھا۔ ان کے ہاں ہر وقت ایک بزم جمی رہتی جس میں علماء، ادیب شاعر، سیاست دان، دکان دار، تاجر غرضیکہ ہر طبقۂ زندگی کے لوگ شریک ہوتے تھے۔

مولانا کی اس مجلس کا نقطۂ عروج اس وقت ہوتا تھا جب نماز عصر کے بعد مولانا اپنے صحن میں چارپائیاں بچھوا کر وہاں بیٹھتے اور ان کے نئے پرانے تمام دوست اکٹھے ہوتے اور دنیا جہان کے موضوعات پر گفتگو ہوتی تھی۔

یہ مجلسیں میرے صفحۂ دل پر نہ صرف اس لئے نقش ہیں کہ اب مولانا کے صاحبزادے اس روایت کو قائم رکھے ہوئے ہیں بلکہ ان کا نقش اس لئے بھی انمٹ ہے کہ ایک ایسی ہی مجلس تھی جس میں میرا مولانا سے اوّل اوّل تعارف ہوا اور میں نے مولانا کو اپنی کتاب "عطاء اللہ شاہ بخاری اور پاکستان" مقدمہ لکھوانے کی غرض سے اوّل تا آخر سنائی کیونکہ ان دنوں مولانا ضعف اور بیماری کے باعث مطالعہ سے معذور تھے۔

بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ کسی مجلس میں شریک ہو کر ہمیں مجلس کے صدر نشین سے دوری کا احساس رہتا ہے کیونکہ وہ اپنے ہم عمروں سے گفتگو میں زیادہ انہماک اور دلچسپی کا مظاہرہ کرتا ہے مگر مولانا کا معاملہ ایسا نہیں تھا۔ ان کی مجلس میں شریک ہر فرد خود کو مولانا کے قریب ترین تصور کرتا تھا کیونکہ مولانا کا اندازِ گفتگو ہی ایسا تھا کہ وہ اپنی بزم میں شامل ہر فرد سے گفتگو کرتے اور سب کو مجلس میں اپنی شمولیت اور اہمیت کا احساس ہوتا رہتا ہے۔

یہ مجلس جہاں مولانا کی زندہ دلی کی علامت تھی وہاں ان کی مخلوق خدا سے بے پایاں محبت

اور خلوص کی بھی آئینہ دار تھی کہ اس میں مولانا کے جاننے والے اور انجان، مولانا سے محبت کرنے والے اور مولانا سے بغض رکھنے والے (جن کی تعداد شاید انگلیوں کی تعداد سے بھی کم ہوگی) مولانا کے قریب رہنے والے اور مولانا سے دور رہنے والے سبھی شرکت کرتے اور اس مجلس کے موضوعات اور صدر نشین کی دلپذیر گفتگو سے حظ اٹھاتے تھے۔

اور پھر مولانا کی شخصیت کا یہ کمال سب سے زیادہ حیران کن تھا کہ ان سے تعلق رکھنے والا ہر شخص یہ خیال کرتا تھا کہ مولانا کو میرے ساتھ جو تعلق ہے وہ کسی اور کے ساتھ نہیں ہے۔ اس کی بنیادی وجہ یہی تھی کہ مولانا کا منافقت سے دور کا بھی واسطہ نہ تھا۔ ان کی شخصیت پر کسی قسم کا کوئی خول نہ تھا وہ خول چڑھا کر زندگی گزارنے کو فعلِ قبیح قرار دیتے تھے اور خود ہمیشہ اس طرزِ حیات سے کوسوں دور رہے۔ سب لوگوں کے لئے ایک سی محبت اور خلوص کسی شخص سے۔ سوائے خدا اور رسول ؐ کے دشمنوں کے بغض نہ رکھتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ انہوں نے ایک کامیاب زندگی گزاری اور اپنی زندگی میں ہی اپنی کاوشوں کے نتائج برآمد ہوتے دیکھ گئے۔

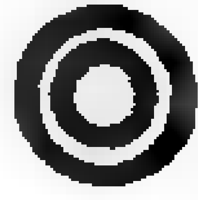
مختصر یہ کہ مولانا تاج محمودؒ اس مادی دور میں صدق و صفا اور اخلاص و وفا کی تصویر تھے۔ ان کی تمام زندگی اخلاص کے ساتھ اپنے مشن کی خاطر جدوجہد کرتے گزری۔ ان کی شخصیت میں ایک عجیب حسن اور دلکشی تھی جس کا احساس ان کے مخاطب اور ہم جلیس کو فوراً ہو جایا کرتا تھا۔ شیریں گفتار کا یہ عالم تھا کہ آدمی اگر ایک بار ان کی مجلس میں بیٹھ جاتا تو پھر اٹھنے کو جی نہ چاہتا تھا

مولانا۔ زندگی بھر کے حادثات، مصائب اور پریشانیوں کے باوجود نہایت ہنس مکھ اور خوش مزاج واقع ہوئے تھے۔ خود ہنستے رہنا اور دوسروں کو ہنساتے رہنا ایک بہت بڑا فن ہے اور مولانا کو اس فن میں کمال حاصل تھا لیکن اس خوش مزاجی کے باوجود وہ محض "ہنسوڑ" نہ تھے بلکہ جب بھی کوئی سنجیدہ مسئلہ درپیش ہوتا تو پوری توجہ اور سنجیدگی کے ساتھ اس پر غور کرتے اور اس کے پس منظر و پیش منظر سے آگاہی حاصل کرنے کے بعد اس پر لب کشائی کرتے اور کوئی بھی قدم اٹھانے سے پہلے اس کے عواقب و مآل پر اچھی طرح غور و خوض کر لیا کرتے تھے۔

غیر ذمہ دارانہ باتوں سے ہمیشہ اجتناب کرتے اور کسی بھی شخص کی دل آزاری سے گریز کرتے۔
انسانوں کی دل آزاری ان کے نزدیک سب سے بڑی معصیت تھی اور چونکہ وہ خود ایک رقیق القلب انسان تھے اس لئے ان سے کسی کی بھی تکلیف نہ دیکھی جاتی تھی اور وہ حتی الوسع دوسروں کی تکالیف و مشکلات کے ازالہ کے لئے ساعی و کوشاں رہتے تھے۔
عالمانہ کبر و نخوت کا دُور دُور تک کہیں نشان نہ تھا۔ ہر شخص سے اس کی سمجھ بوجھ اور استعداد کے مطابق گفتگو کرتے اور کسی بھی شخص کو مایوس نہ کرتے۔
غرضیکہ ہر لحاظ سے ایک صاف ستھرا اور اجلا انسان جس کے کردار کا یہ عالم تھا کہ۔

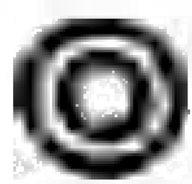
ع دامن نچوڑ دے تو فرشتے وضو کریں

مکتوبات



"نجی خطوط میں اور خاص کر ان خطوط میں جو اپنے عزیز اور مخلص دوستوں کو لکھے جاتے ہیں ایک خاص دلچسپی ہوتی ہے جو دوسری تصانیف میں نہیں ہوتی ان کی سب سے بڑی خوبی بے ریائی ہے۔ تکلف کا پردہ بالکل اٹھ جاتا ہے اور مصلحت کی دراندازی کا کھٹکا نہیں رہتا۔ گویا انسان خود اپنے سے باتیں کر رہا ہے جہاں اندیشہ لازم نہیں ہے۔ یہ دلی خیالات اور جذبات کا روزنامچہ اور اسرار حیات کا صحیفہ ہوتا ہے۔ پھر کون ہے جو اس خاموش آواز کے سننے کا مشتاق نہ ہوگا؟ - یہ ہماری فطرت میں ہے اور یہی وجہ ہے کہ ہم روزنامچوں آپ بیتیوں اور خطوں کو بڑے ذوق و شوق سے پڑھتے ہیں۔ ان میں وہ صداقت اور خلوص ہوتا ہے جو دوسرے کلام میں نظر نہیں آتا۔ یہاں انسان بچپن کی سی سادگی سے بلا تصنع ان خیالات کو بیان کرتا ہے جو اس کے دل و دماغ میں گزرتے ہیں جنہیں نہ انشا کی صنعت مسخ کر سکتی ہے اور نہ تشبیہات و استعارات کا بوجھ دبا سکتا ہے۔"

بابائے اردو مولوی عبدالحق



تعارف

از

اصغر حسین خاں نظیر لودھیانوی

تاج محمودؒ کے خطوط ہیں یہ
ان میں زاہد منیرؔ سے ہے خطاب

ہے مخاطب کے واسطے رہبر
خلق و انس و خلوص کی یہ کتاب

ہے صداقت نواز ہر نکتہ
ہے محبت فروز ہر القاب

لہجہ ہر خط کا اُنس پروردہ
ہر ورق نامۂ فلاح و ثواب

شان ہر سطر میں بزرگی کی
رو نیت برق جیسے زیر سحاب

بے محابا کہیں مبارک باد
کیوں نہ زاہد منیر کے احبابؔ



(۱)

*

عزیزم زاہد تحریر سلمہ اللہ تعالیٰ

السلام علیکم۔ آپ کا خط ملا۔ خیریت معلوم ہوئی مجھے افسوس ہے کہ آپ کے گھر والوں کو آپ کا گھر سے غیر حاضری پر پریشانی ہوئی اور یہ ایک طبعی بات ہے۔ دینی اور نیک گھرانوں میں بچے کے متعلق معلوم نہ ہو تو پریشانی ہو جاتی ہے۔[۱] آئندہ میرے گھر آنا ہو تو گھر پر اپنا پورا پروگرام بتا کر آیا کرو۔ یہاں میرا گھر یا حضرت مفتی زین العابدین کا گھر تیرے لئے اپنے ماں باپ کا گھر ہے۔

امید ہے جو کچھ حوالہ جات آپ نے نوٹ کر لئے تھے انہیں ابھی اپنی جگہ فٹ کر دیا ہوگا۔ شاہ جی کے باب میں تعمیر پاکستان کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ انہوں نے ماسٹر تاج الدین انصاری کے نام اپنے خط[۲] کی روشنی میں، جو کہ آئندہ کے لئے بنیادی پالیسی بن گیا۔ ایک کارنامہ یہ بھی سرانجام دیا کہ انگریز کے خود کاشتہ پودے "مرزائیت" کے تعاقب کے لئے منظم کام کرنے اور پاکستان کو تخریبی فتنوں سے محفوظ کرنے کے لئے احرار کے نام کو قربان کر کے جمیع مسلمانوں کے لئے مجلس تحفظ ختم نبوت کی بنیاد رکھی اور سیاسی تنقید اور گروہ بندی کی گندگی سے

---

* مرتب کے نام یہ مولانا تاج محمود کا پہلا خط ہے۔ اس پر تاریخ کا اندراج نہیں ہے لیکن یہ خط مجھے جولائی ۸۲ء کے پہلے ہفتے میں موصول ہوا تھا۔

[۱] جولائی ۸۲ء میں راقم الحروف بعض حوالہ جات کی تلاش کے لئے مولانا کے ہاں دو ایک روز قیام کے ارادہ سے فیصل آباد گیا مگر کام کی زیادتی کے پیش نظر ایک آدھ دن زیادہ ٹھہرنا پڑا جس کی وجہ سے میرے گھر والوں کو پریشانی ہوئی۔ میں نے مولانا کے نام اپنے خط میں اس چیز کا ذکر کیا تو انہوں نے یہ جواب دیا۔

[۲] یہ خط میری کتاب "سید عطاء اللہ شاہ بخاری اور پاکستان" کے صفحہ ۸۰ پر موجود ہے۔

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

دعا گو ۔ قاری محمود غفرلہ

خطیب جامع مسجد ریلوے کالونی

فیصل آباد

(۲)

۱۴ر جولائی ۱۹۸۲ء

عزیزم زاہد منیر صاحب سلمہ اللہ تعالیٰ

السلام علیکم۔ بیٹا جی! آپ کا خط ملا جس سے آپ کے لاہور کے سفر کے حالات معلوم ہوئے۔ یہ ٹھوکریں اور تلخیاں[1] دراصل زندگی کے تجربات ہوتے ہیں جن کے بعد آدمی کو معلوم ہوتا ہے کہ چمکنے والی ہر چیز سونا نہیں ہوتی۔ جن لوگوں کا آپ نے تلخ تجربہ لکھا ہے یہ لوگ اگر نقلی نہ ہوتے، اصلی ہوتے تو آج تک شاہ جی[2] پر دسیوں بیسیوں کتابیں چھپ چکی ہوتیں۔ بہرحال سید عبداللہ کام کے آدمی ہیں لیکن بہت بوڑھے ہو چکے ہیں۔ بیگم چودھری افضل حق نے جو کچھ زبانی کہہ دیا ہے وہی کافی ہے۔ میری ایک دن مسعود شورش سے فون پر بات ہوئی تھی انہوں نے آپ کی لاہور میں آمد کا مجھے بتایا تھا۔ مجھے شورش مرحوم کی کتاب "تحریکِ ختمِ نبوت"[3] کی دو سو کاپیاں درکار تھیں۔ آدمی بھیجا لیکن صرف پچاس کتابیں دستیاب ہوئیں۔ اب "عجمی اسرائیل" اور اس کا انگریزی ترجمہ منگوانے کا خیال ہے۔ اب پھر کبھی آدمی کو بھیجوں گا۔

---

[1] میں اپنی کتاب "سید عطاء اللہ شاہ بخاری اور پاکستان" لکھنے کے بعد اس کے چھپنے تک مزید معلومات و تفصیلات کی تلاش میں کوشاں رہا۔ جولائی ۸۲ء میں اپنے تئیں اگرچہ میں کتاب مکمل لکھ چکا تھا مگر پھر بھی یہ جنون سر پہ سوار تھا کہ کوئی بات شامل ہونے سے رہ نہ گئی ہو اس لئے ایک بار پھر لاہور کا سفر اختیار کیا اور بہت سے "نامور" لوگوں سے رابطہ قائم کیا۔ مگر ان حضرات نے مجھے خاصا پریشان کرنے کے بعد میری مطلوبہ کتب و معلومات کی فراہمی سے جو واقعتاً ان کے پاس موجود تھیں انکار کر دیا۔ مولانا تاج محمود کے ساتھ میرا جو نیاز مندانہ تعلق قائم ہو گیا تھا اور مولانا نے میرے ساتھ جس محبت و خلوص کا مظاہرہ فرمایا تھا اس کی بناء پر میں نے اپنا یہ دکھ ان کو خط میں بھی لکھ دیا جس پر مولانا نے یہ جواب دیا۔

[2] اس مجموعے میں جہاں بھی لفظ شاہ جی یا شاہ صاحب استعمال ہوا اس سے امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری مراد ہوں گے۔

[3] شورش کاشمیری کے لکھے ہوئے ایک کتابچہ کا نام جس میں قادیانیت کا سیاسی تجزیہ کیا گیا ہے۔

یہ کتابیں اسلام آباد سیکریٹریٹ اور سپریم کورٹ و ہائی کورٹ کے ججوں اور اعلیٰ تعلیم یافتہ طبقہ میں تقسیم کرنے کا خیال ہے۔

بیٹا! لولاک آپ کے نام جاری ہے نہ جانے آپ کو کیوں نہیں ملتا؟ دراصل اپنی نوعیت کا دلچسپ دینی اور تبلیغی پرچہ ہے اس لئے ڈاک والے بھی چرا لیتے ہیں۔ آپ کا مضمون مع ابتدا میں میری چند تعارفی سطروں کے چھپ گیا[1] نظم کے اشعار بھی چھپ جائیں گے۔ میٹر کافی ہوتا ہے اس لئے باری آنے پر چھپتا ہے۔ آپ کی حالیہ نظم اس سیاہ کار کی تعریف پر مبنی ہے اس کو چھاپنا دراصل میری عزت نفس کے خلاف ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو ایک سلجھا ہوا لکھنے پڑھنے والا انسان بنائے۔ میرے مرنے کے بعد جو مرضی چھاپتے رہنا۔ میرے سامنے مجھ گنہگار اور عاجز انسان کی تعریف؟ یہ دراصل میں نے کبھی چھپنے نہیں دی۔

میرے ابتدائیہ کی فکر نہ کریں میں نے قلم خرید لیا ہے اور ابھی خطوط لکھنے شروع کئے ہیں[2] اس دفعہ کا اداریہ بھی لکھ دیا ہے۔ دل و دماغ اور ہاتھوں میں کچھ طاقت آجائے تو ابتدائیہ لکھ دوں

---

[1] میری مذکورہ کتاب سے ایک مضمون لولاک کے ایڈیٹر صاحب نے لولاک میں شائع کرنے کے لئے رکھا تھا جس کے آغاز میں مولانا نے کتاب کے بارے میں ایک بھرپور نوٹ لکھ کر لولاک کی اشاعت مورخہ ۱۶ر جولائی ۸۲ء میں شائع کیا۔

[2] ان دنوں مولانا دل کی ایک مہلک بیماری کے حملہ سے نئے نئے صحت یاب ہوئے تھے اور چونکہ اس طویل بیماری کے دوران مولانا کے معمولات رک گئے تھے اور اب مولانا اپنے معمولات کو بحال کر رہے تھے اس لئے انہوں نے یہ بات لکھی۔

قلم خریدنے کا قصہ دلچسپ ہے کہ پہلے مولانا نے ایک قلم خریدا جو مولانا کے ہاتھ پر رواں ہو گیا مگر وہ جلد ہی کسی صاحب نے اٹھا لیا جس پر مولانا بہت سٹپٹائے اور کئی دن تک یہ مسئلہ زیر بحث رہا کہ مولانا کا قلم کہاں گیا۔ وہ قلم نہ مل سکا اور بالآخر مولانا نے دوسرا قلم استعمال کرنا شروع کر دیا ان دنوں ہم اس فقرہ کو مسئلہ کشمیر سے تشبیہ دیا کرتے تھے

گا اور دل کی گہرائیوں سے لکھ دوں گا۔

چونکہ آپ اس سلسلہ میں ناواقف ہیں اس لئے ہم آپ کے مسودہ کی کتابت شروع کرا دیں گے اور جو چیزیں بعد میں تیار ہوں گی وہ سب اپنی اپنی جگہ لگ جائیں گی۔ آفسٹ کی چھپائی میں گنجائش ہوتی ہے اور الف سے لے کر ے تک مواد تیار کر کے کاتب کو دینے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ گھر میں سب کو سلام اور دعوات۔

مزید

میرا خیال تھا کہ لاہور سے واپسی پر فیصل آباد سے گزر گے۔ وقت گذرنے کے ساتھ آپ اور آپ کے خاندان والوں کو معلوم ہو جائے گا کہ یہ بھی آپ کا اپنا گھر ہے۔ میری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کو نیکی پر استقامت بخشے، نیک نصیب کرے اور علم و عمل میں ارزانی کی توفیق بخشے۔ والسلام

دعاگو۔ تاج محمود غفرلہ

---

(۳)

۲۹ر جولائی ۱۹۸۲ء

عزیزم زاہد منیر! سلمہٗ اللہ تعالیٰ

السّلام علیکم ورحمۃ اللہ۔ مزاج گرامی۔ بیٹا جی! آپ کا خط ملا۔ احوال سے آگاہی ہوئی حنیف صاحب تا حال عید کی تعطیلات سے واپس نہیں آئے۔ ایک تو انہیں خود خوشنویسی سے شغف ہے بلکہ وہ درمیانے درجے کے کاتب بھی ہیں۔ مارکیٹ میں جتنے خوشنویس بیٹھے ہوئے ہیں ان سے ان کی شناسائی ہے۔ مَیں چاہتا تھا کہ کاتب کا انتخاب ان کے مشورہ سے ہو۔ کتابت دراصل کتاب کی جان ہوتی ہے اس میں دو چار دن کا فرق پڑ جائے تو کوئی حرج نہیں۔[1]

---

[1] کتاب کی کتابت و طباعت سے متعلق تمام مباحث میری کتاب سید عطاء اللہ شاہ بخاری اور پاکستان کے بارے میں ہیں

دوسرے مجھے کتاب میں جو چیز کھٹکتی ہے وہ یہ ہے کہ کتاب کا انداز تحقیق کا ہے۔ اگر اسے کسی یونیورسٹی میں بطور تھیسز (مقالہ) جمع کرانا ہو تو بالکل ٹھیک ہے لیکن اگر یہ عوام کے ہاتھوں میں جانی ہے تو اس میں ایسا مواد ضرور ہونا چاہیئے جو یقیناً تحقیق اور ریسرچ ہی سے تعلق رکھتا ہو۔ لیکن اس میں عوام کی دلچسپی کی بھی کوئی بات ہو۔

اس وقت شاہ جیؒ کے ورثا میں عوام کے علاوہ تین بلکہ چار دھڑے ہیں۔ پہلا دھڑا شاہ جیؒ کی اولاد ہے۔ میرے لئے وہ قابلِ احترام ہیں۔ دوسرا اور تیسرا دھڑا مجلس احرار کے دو گروپ ہیں۔ ایک کے بڑوں میں ان جیسے لوگ شامل ہیں جن کا آپ کو کچھ تجربہ لاہور کے سفر سے ہو گیا ہوگا اور دوسرے کے سربراہ شاہ جی کے بڑے صاحبزادے ہیں جن میں ملک سے ان کے ہم مزاج افراد شامل ہیں۔

شاہ جیؒ نے ملک کی تقسیم کے بعد صرف یہی عالی ظرفی نہ دکھائی تھی کہ دل کی گہرائیوں سے پاکستان کو تسلیم کیا بلکہ اس کی تقدیس وہ یوں بیان فرمایا کرتے تھے کہ سراج الدولہ شہید ۱۷۵۷ء سلطان ٹیپو شہید ، تحریکِ آزادی ۱۸۵۷ء ۱۸۳۰ء شہدائے بالاکوٹ ، کے شہداء اور ۱۹۴۷ء کے شہداء کے خون کا صلہ یہ پاکستان ہے۔ یہ صرف مسلم لیگ کی تحریک کا نتیجہ نہیں ہے۔ وہ کہا کرتے تھے کہ آدمی کھانا کھاتے کھاتے آخری نوالے پر سیر ہو جاتا ہے تو اس کے سیر ہونے کی وجہ صرف آخری نوالہ نہیں ہوتا بلکہ پہلے نوالے سے آخری نوالے تک تمام نوالے مل کر اسے سیر کرتے ہیں۔

اور انہوں نے اپنی اعلیٰ ظرفی اور پاکستان کے استحکام و بقا کی خاطر یہاں تک کیا کہ اپنی جماعت توڑ دی، زندگی بھر کا سرمایہ نہ بکنے والے اور نہ جھکنے والے کارکن اور رضاکار بھی لیگ کے حوالے کر دیئے اور یہ فرمایا کہ انگریز چلا گیا لیکن اس کا دُمچہ قادیانی ابھی موجود ہے جو انگریزوں کا خود کاشتہ پودا ہے۔ مَیں انگریزوں کی اس جڑ کو بھی اکھاڑنے میں لگا رہوں گا۔ یہ نعرہ ایسا تھا کہ تمام مسلمانوں کو سمجھ بھی آتا تھا اور اس کے لئے حصہ لینے کا ارادہ بھی کرتے تھے لیکن شاہ جیؒ اور مسلمانوں کی اکثریت

کے درمیان لفظ "احرار" کی چڑ موجود تھی چنانچہ شاہ جیؒ نے احرار' اپنے ان ساتھیوں کے سپرد کی جو صرف سیاسیات سے دلچسپی رکھتے تھے جب کہ جماعت کے باقی تمام علماء، صُلحا اور دینی مزاج رکھنے والوں کو فرمایا کہ مسلمانوں اور احرار کے درمیان جو چیز پردہ یا حجاب کی ہے اس کو ترک کر دو۔ احرار کا لفظ چھوڑ دو"۔ چنانچہ آپ نے نئی تنظیم قائم کی جس کا نام مجلس تحفظ ختم نبوّت رکھا اور اس کے دستور کی ابتداء میں لکھوا دیا کہ سیاست سے ہمارا کوئی تعلق نہ ہوگا۔ بلکہ آخری عمر میں فرمایا کرتے تھے کہ یہ الیکشنی سیاست میرے لئے سوٗر کی بوٹی ہے۔ تحفظ ختم نبوّت، فضائل صحابہؓ، فضائل آلِ بیت کا اظہار اور دعوتِ اعمالِ صالحہ کا کام کروں گا اور آخری دم تک اسی عہد پر قائم رہے۔ کرایہ کے مکان میں رہے اور وہیں سے جنازہ اٹھا۔ فقر و فاقہ اور سادگی میں زندگی بسر کی اور تبلیغ اسلام کو اوڑھنا بچھونا بنائے رکھا۔

مَیں چاہتا تھا کہ تمہاری کتاب میں ایک بھرپور باب ان کی اس خدمت پر آجاتا۔ ایک تو یہ کہ یہ ان کی خالص دینی خدمت تھی اور دوسرے یہ کہ وہ پاکستان سے اپنی وفاداری کی بناء پر یہ چاہتے تھے کہ اب اس ملک کی ترقی کی راہ میں کوئی روڑہ نہ اٹکایا جائے۔ چنانچہ انہوں نے سیاست سے علیحدہ ہو کر اور خالص دینی و تبلیغی کام کر کے اس پر عمل کر کے دکھایا۔ تیسری بات میرے سامنے یہ ہے کہ شاہ جی نے تقسیم سے لے کر وفات تک اسی جماعت کا ساتھ دیا، اس کی سرپرستی کی، ملک کے کونے کونے میں پھرے اور اس کی تنظیمیں قائم کیں تو میرے خیال میں ان کے ورثا کا یہ گروہ سب سے زیادہ منظم، فعال اور ملک میں پھیلا ہوا ہے۔

ایک بات جو مَیں کہے بغیر نہیں رہ سکتا وہ یہ ہے کہ شورش صاحب اور ان کی کتاب کا ذکر تو کیا گیا لیکن آپ کا ذہن ان حلقوں سے متاثر ہوا جن کا ذکر بھی شورش کے بالمقابل نامناسب ہے۔ افسوس کہ آپ نے اس مردِ قلندر کو دیکھا نہیں[1]۔

آپ کا اس کتاب پر تبصرہ محض اپنے مطالعہ کی بنا پر ہونا چاہیئے اور آپ کی تحریریں کسی

---

[1] میں نے اپنی کتاب کے باب "امیر شریعت پر اب تک ہونے والا تحریری کام" میں بعض حضرات

کے پراپیگنڈے کا کوئی اثر نہیں آنا چاہیئے تھا۔

میں خود اُس مجلس کا عینی گواہ ہوں جس مجلس میں شورش نے اپنی کتاب شاہ جی کو ایک نظر دیکھنے کے لئے پیش کی تھی لیکن اس وقت شاہ جی کی طبیعت بیماری کے باعث بہت کمزور اور بےچین سی تھی انہوں نے اپنی طبیعت کی ناسازی کی وجہ سے اسے پڑھنے یا سننے سے معذوری ظاہر کی تھی اور واقعی اُس وقت ان پر بیماری کے دورہ کی سی کیفیت تھی جس کا بار لوگوں نے افسانہ تراش لیا اور خدا کے خوف سے عاری ہو کر اس میں مزید اضافے بھی شامل کر لئے۔ لیکن اس حرکت کے باوجود شورش کی کتاب جس پایہ کی ہے وہ ماشاءاللہ اسی پایہ کی ہے۔ اور ان کی کتاب پر ملک کے اخبار نے ایسا کوئی تبصرہ نہیں کیا جیسا کہ آج کل کے بعض مایہ ناز ادیبوں اور مؤرخوں کی کتابوں پر جنگ جیسے اخبار نے کر دیا ہے۔ آپ کے ذہن کا یہ پہلو صاف ہونا بہت ضروری ہے۔

میری طبیعت رمضان شریف کے آخری عشرے میں زیادہ تقریریں کرنے اور تقریبات میں جانے کی وجہ سے سخت کمزور ہو گئی ہے۔ کہیں آنے جانے سے معذور ہوں ورنہ میں ایک ہفتہ کے لئے راولپنڈی آب و ہوا تبدیل کرنے کے لئے جانا چاہتا تھا مگر اتنی ہمت نہیں ہے۔

ایک بات جو بڑی ضروری ہے وہ یہ کہ کتاب کا مواد کاتب تب لکھ سکے گا جب وہ کاغذ کے صرف ایک طرف صاف صاف لکھا ہوا ہو شکستہ اور ٹوٹے پھوٹے الفاظ وہ غلط لکھے گا۔

کی روایتوں سے متاثر ہو کر یہ لکھ دیا تھا کہ حضرت شاہ صاحبؒ، شورش کاشمیری کی کتاب "سید عطاء اللہ شاہ بخاری" کے بارے میں خوش رائے نہیں تھے اور وہ اسے شورش کاشمیری کی شورش کاشمیری ہی پر لکھی جانے والی کتاب سمجھتے تھے۔ جب مولانا نے میری کتاب کو سنا (ان دنوں علالت کی وجہ سے مولانا پڑھ نہ سکتے تھے) تو انہوں نے اس حصہ کے بارے اپنی اسی رائے کا اظہار کیا۔ چنانچہ بعد میں کچھ اور شواہد مل جانے اور مولانا کی اس رائے کی بنا پر میں نے شورش صاحب کی کتاب پر تبصرہ کے الفاظ تبدیل کر دیئے۔ میری رائے نفس کتاب کے بارے میں پہلے بھی وہی تھی جو اب میری کتاب کے صفحہ نمبر ۱۲۵ پر درج ہے۔ تبدیلی یہ کی گئی کہ شورش صاحب کی کتاب پر حضرت شاہ صاحب کی مبینہ رائے کو میں نے اپنی کتاب سے نکال دیا۔

پھر جب ہم اس کی غلطیاں لگوائیں گے تو چھپائی میں داغ آئیں گے۔ براہِ کرم سفید یا لکیر دار کاغذ لے کر اس کے صرف ایک طرف مسوّدہ لکھا ہوا ہو اور جہاں سے جو چیز آگے پیچھے کرنی ہو، وہ سوچ سمجھ کر پہلے کر لیں۔

میں آپ کی حوصلہ شکنی کرنے کے لئے نہیں بلکہ حقیقت واضح کرنے کے لیے کہتا ہوں کہ کتابیں خریدنے کے معاملے میں جماعتِ اسلامی کے حلقوں کو چھوڑ کر باقی دینی حلقے سخت کنجوس واقع ہوئے ہیں۔ اس لئے ہمیں اسی بارے میں بھی ابھی سوچنا ہے۔

دو تاریخ کے بعد آپ تشریف لائیں۔ مسوّدہ ٹھیک ٹھاک کر کے لے آئیں۔ پریس والوں کو آپ کے سامنے ہی بلاؤں گا اور آپ کی اور حنیف صاحب کی موجودگی میں اس پر مشورہ ہو جائے گا کہ کاغذ کونسا لگایا جائے۔ کتاب کا سائز کیا رکھا جائے اور کاتب کون ہو؟ اپنے کاتب سے بات کرنا آخر کی بات ہے۔ اور کوئی بہتر کاتب نہ میسّر آیا تو یہ برا نہیں۔ کتابیں چھپوانا آسان کام نہیں ہے آپ ماشاء اللہ خود سمجھ دار ہیں۔ میں خود تو بیمار اور ضعیف ہوں کہیں آنے جانے سے معذور ہوں اور حنیف صاحب 'لولاک' کی ذمہ داریوں سے فارغ نہیں ہوتے۔ اس لئے کبھی کبھار یہ بھاگ دوڑ کی تکلیف آپ کو خود کرنا پڑے گی۔ اس کے لئے یا تو آپ کو اپنے کچھ دن مکمل فارغ کرنا پڑیں گے یا پھر روزانہ فیصل آباد آ کر واپس جانا پڑے گا۔ اور میں تو آپ کی اس قلمی کاوش سے اتنا متاثر ہوا ہوں کہ آپ کو اپنا بیٹا کہا ہے۔ اور اس کتاب کے اخراجات کا اندازہ میں نے اپنے پاس علیحدہ رکھ دیا ہے۔ اگر آپ مذکورہ طریقہ کار سے مطمئن نہ ہوں تو وہ پیسے مجھ سے لے لیں اور جہاں کہیں آپ کو کتابت کی سہولت اور بہتری میسّر آسکے وہاں سے کرالیں۔

میرا دل چاہتا ہے کہ جس عظیم انسان اور ہمارے محسن و مربی، خصوصاً میرے ساتھ اُنکی شفقتیں اَن گنت ہیں، کے دفاع میں آپ نے جو سطریں لکھی ہیں ان میں میں اپنی ذہنی اور تجربے کی صلاحیتیں بھی شامل کر دوں اور جو تعاون لِوجہ اللہ مجھ سے ہو سکتا ہے وہ بھی کردوں

تاکہ اپنے لئے ذخیرۂ آخرت حاصل کرسکوں ۔ ایسے کام صبر، تدبیر اور طریقہ سے ہوتے ہیں جھٹ پٹ یا کوئی خام خیالی ذہن میں رکھ کر نہیں ہوتے ۔ آپ نہ تو خود کسی غلط فہمی کا شکار ہوں اور نہ ہی اپنے نیک بھائی کو کسی غلط فہمی میں مبتلا رکھیں ۔

کچھ دن قبل ختمِ نبوت ملتان کے رہنما یہاں تشریف لائے تھے دو تین دن یہاں ٹھہرے ۔ میں نے ان سے ذکر کیا تھا انہوں نے بھی مناسب تعاون کا وعدہ کیا ہے ۔ والسلام

دعاگو ۔ تاج محمود غفرلہٗ

---

(۴)

۲۲ اگست ۸۲ء

عزیزم زاہد صاحب !

السلام علیکم ۔ مزاج گرامی ۔ کتاب کا مسوّدہ واپس آگیا تھا[۱] ۔ اب گوجرانوالہ پہنچ گیا ہے اور وہاں اس کی کتابت شروع ہے ۔ کاتب نے اخراجاً ریٹ طے نہیں کیا اور کہا کہ مجھے جو مولانا دیں گے لے لوں گا ۔ جو جو حصہ لکھا جاتا رہے گا ، رجسٹرڈ بھیجتا رہوں گا تاکہ آپ پڑھ سکیں پہلی قسط کانفرنس[۲] پر خود لے کر آؤں گا ۔

"کانفرنس نمبر"[۳] کی کتابت ہو رہی ہے ۔ کانفرنس سے پہلے چھپ جائے گا ۔ تذبذب میں ہیں کہ پہلے کوئی شمارہ شائع کریں یا نہ کریں ؟ اگر پرچہ درمیان میں چھپا تو آپ کا مرتب کردہ اشتہار[۴] ،

---

[۱] کتاب کا مسوّدہ ابتداءً فیصل آباد کے ایک کاتب کو دیا گیا تھا جس کی کتابت پسند نہ آنے پر واپس منگوا لیا تھا ۔

[۲] پہلی آل پاکستان ختم نبوت کانفرنس ربوہ منعقدہ ۶ ، ۷ ستمبر ۸۲ء

[۳] مولانا سے سہو ہوا ۔ کانفرنس نمبر نہیں "امیر شریعت نمبر" کا ذکر ہے جو راقم الحروف نے مولانا کے ارشاد پر ترتیب دیا تھا ۔ ۱۰۴ صفحات پر مشتمل "لولاک" کا یہ شاندار نمبر ۳ ستمبر ۸۲ء کو شائع ہوا ۔

[۴] امیر شریعت نمبر کا دو ورقہ اشتہار جو لولاک میں شائع کرنے کے لئے ترتیب دیا گیا تھا ۔

شائع ہو جائے گا اور اگر کاغذ کی بچت کے نقطہ نظر سے یہ پرچہ ہی نہ چھپا تو یہ اشتہار رہ جائے گا۔[1]
کل صبح بذریعہ کار سرگودھا سے گزر کر مولانا خان محمد صاحب کے پاس جاؤں گا۔ اگر دہلی پر زیادہ دیر نہ ہو گئی تو تیرا گھر تلاش کرنے کی کوشش کروں گا۔ صحت سفر کی اجازت نہیں دیتی اور نہ ہی موسم موافق ہے لیکن حضرت صاحب سے ملنا ضروری ہے قومی اور ملکی حالات ایسے ہیں۔ امید ہے گھر میں ہر طرح سے خیریت ہو گی۔ سب کو احقر کی طرف سے سلام مسنون عرض کریں۔

تمہارا اور تمہارے سب متعلقین کا دعا گو

تاج محمود غفرلہٗ

۵

۱۵ ر ستمبر۔ فیصل آباد

میرے عزیز بیٹے زاہد منیر!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ۔ مزاج گرامی۔ بیٹے تمہارا عالم وارفتگی میں لکھا ہوا خط ملا[2] شاہ جی پر جو کچھ کام تم کر چکے ہو اور شاہ جیؒ کے محاسن و مناقب کی جزئیات تک تمہارے سامنے آ چکی ہیں۔ اب اس کے بعد جب تم ان کی قبر مبارک پر پہلی دفعہ حاضر ہوئے تو یہ کیفیت طاری ہونا ایک قدرتی امر تھا لیکن تم نے ان لوگوں کو غور سے نہیں دیکھا جو اپنے طبعی بڑھاپے سے پہلے ہی بوڑھے نہیں ہو گئے بلکہ لاشوں کی صورت اختیار کر گئے ہیں۔ آخر کیوں؟ اس لئے کہ ساتھی چھوٹ گئے اور

---

[1] نمبر سے پہلے معمول کا شمارہ نہ چھپ سکا اور یہ اشتہار رہ گیا۔

[2] ستمبر ۸۲ء میں راقم الحروف پہلی مرتبہ ملتان میں حضرت شاہ صاحب علیہ الرحمۃ کی قبر پر حاضر ہوا تو قبر کے سرہانے بیٹھ کر اپنی قلبی کیفیات ایک خط کی صورت میں رقم کیں جسے بعد ازاں مولانا تاج محمودؒ کو ارسال کر دیا۔ یہ خط میرے اسی طویل جذباتی خط کا جواب ہے جو میں نے مولانا کو ملتان سے پوسٹ کیا تھا۔ یہ خط "شاہ جیؒ کے مزار سے زاہد منیر عامر کا خط مولانا تاج محمود کے نام" کے عنوان سے ہفت روزہ "لولاک" کے شمارہ بابت ۱۸ ستمبر ۸۲ء میں شائع ہو چکا ہے

آج ہم اپنے گھروں میں غریب الوطنی اور یاس وحسرت کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ زندگی کیا بسر کر رہے ہیں اپنی زندگیوں کے دن پورے کر رہے ہیں۔ تمہارا خط پڑھا تو بے اختیار جی میں آیا کہ زاہد سامنے ہوتا تو اسے اپنے جیسے ایک دکھیا شاعر کا شعر سناتا ۔

اے شمع! تو نے رات گزاری ہے جس طرح
ہم نے تمام عمر گزاری ہے اس طرح

بھائی! اب تو آنکھوں کے آنسو بھی خشک ہو گئے۔ لوگ ہمیں اکثر ہنستا دیکھتے ہیں۔ وہ یہ نہیں سمجھتے کہ ہماری ہنسی ہنسی نہیں ہے، زہر خندہ ہے ....

بہر حال اچھا ہوا جو تم شاہ جی سے مل آئے۔ وہ آرام فرما رہے ہوں گے۔ انہوں نے تم سے کسی موضوع پر بات نہیں کی ہوگی۔ ممکن ہے صائب اصفہانی کا یہ شعر اس فضا میں آپ نے سن لیا ہو۔

اے صبا! بر برگ ہائے غنچہ پا آہستہ نہہ
پاسبانان اند گلہا صاحبا خوابیدہ است

یا پھر میر تقی میر اپنے لیے لکھا ہوا یہ شعر شاہ جی کے مزار پر گنگنا تے سنائی دیئے ہوں گے۔

عہدِ جوانی رو رو کاٹا پیری میں لیں آنکھیں موند
یعنی رات بہت تھے جاگے صبح ہوئی آرام کیا

زاہد بیٹا! چھوڑو اس بحث نے تو ہمیں یہاں تک پہنچا دیا کہ آج نہ زندہ ہیں نہ مردہ۔ بس پھر میر یاد آتے ہیں۔

تہمتیں چند اپنے ذمے دھر چلے
کس لئے آئے تھے ہم کیا کر چلے (میر درد)

تمہارے جانے کے بعد ربوہ کی بڑی کامیاب کانفرنس ہوئی۔ ۱۹۴۶ء کی قادیان کانفرنس کا بھی ریکارڈ ٹوٹ گیا۔ ہم نے کوئی پینتیس چالیس ہزار کی حاضری کا اندازہ لگا کر کھانے کا انتظام کیا!

تھا لیکن دن کے اجلاسوں میں حاضری ایک لاکھ سے اور رات کے اجلاسوں میں ڈیڑھ لاکھ سے متجاوز ہو جاتی رہی۔

کانفرنس پر جتنا گیا سب فروخت ہو گیا، بلکہ لوگ پیاسے گئے۔ خریداروں کو پرچے بشکل بنڈل بھیجے ہیں۔ انفرادی خریداروں میں بھی سب کو پرچہ نہیں دیا گیا بس اہم لوگوں کو بھیج دیا گیا۔ کچھ پرچے میں نے تمہارے لئے محفوظ رکھے ہوئے ہیں۔ جہاں ضروری بھیجنا ہو مجھے فہرست معہ پتہ جات بھیجئے، میں خود بھجوا دوں گا حنیف صاحب کا تو آپ کو معلوم ہی ہے۔

پرچہ بے حد پسند کیا گیا۔ زاہد منیر، شاہ جیؒ کا کوئی پرانا بوڑھا ساتھی سمجھ لیا گیا۔ اب آہستہ آہستہ لوگ تمہیں جانیں گے۔

آپ نے لکھا ہے کہ "دل تو چاہتا ہے کہ آپ سے ملوں"۔ بیٹا یہی ہمارا دل بھی چاہتا ہے مگر مجھے تمہاری تعلیم کی فکر ہے۔ میری مجبوری یہ ہے کہ میں تمہارے لئے حقیقی بڑے بھائی یا والد کی طرح سوچتا ہوں۔ میں آپ کو پھر یہی نصیحت کروں گا کہ اتنی جلدی کسی نمبر کی تیاری میں منہمک ہونے کی بجائے یہ درمیان کی منزل طے کر لو پھر ساری زندگی جو تمہارے دل میں آئے کرنا زیادہ سے زیادہ یہی قیامت آئے گی کہ اس وقت ہم نہ ہوں گے۔

میرا اللہ آپ سب کو سلامت رکھے۔ سکونِ قلب اور سکونِ دماغ نصیب فرمائے

میں یہ لکھنا بھول گیا کہ تمہاری شاہ جیؒ سے محبت اور اخلاص کا اثر یہ ہوا کہ کانفرنس میں پرچہ کراچی سے خیبر اور دوانگہ سے ژوب تک گیا ہے۔ "عجمی اسرائیل" اور "عقائد و عزائم" ساتھ مفت تقسیم کر دیئے گئے۔

آپؒ کے کانفرنس میں شریک نہ ہو سکنے کا بہت صدمہ رہا۔ خدا تعالیٰ زندگی رکھے پھر سہی۔ اگرچہ گوجرانوالہ کا کاتب، حنیف صاحب نے مجھے نہیں ملایا تاہم اس کا پیغام دیا تھا کہ

ا۔ ہفت روزہ "لولاک" کے "امیر شریعت نمبر" کا ذکر ہے جو راقم الحروف نے مرتب کیا تھا۔

۲۔ میرا ارادہ "چوہدری افضل حق نمبر" ترتیب دینے کا تھا

میں کتاب جلد لکھ کر پہنچا دوں گا۔

اور زاہد یہ کبھی نہ بھولا کرو کہ میں تمہارے لیے دینی و دنیوی فلاح و فروغ کی ہمیشہ دعا کرتا ہوں خدا کے ہاں قبول ہوتی یا نہیں۔ لیکن میرا اخلاص مجھے آپ کی بھلائی چاہنے کے لئے مجبور کرتا رہتا ہے تم ایک خاندانی بچے ہو اور خاندانی بچے ۱ اور ہوا کرتے ہیں۔ کمر ڈھیلی کر کے جن لوگوں کی پہلے ہی کمریں ٹوٹ چکی ہیں اور دل پارہ پارہ ہیں ان کی حوصلہ شکنی نہ کیا کرو۔

دعاگو۔

تاج محمود عفرلہٗ

۶

میرے پیارے بیٹے زاہد!

السلام علیکم۔ امید ہے میرا پہلا خط، جو تیرے خط کے جواب میں میں نے لکھا تھا مل گیا ہوگا۔ یہ خط ملاقات کا بدل تو نہیں ہو سکتے۔ یہی دعا کرتا ہوں کہ تم بخیریت رہو۔ اپنے کام میں تمہارا دل لگے اور پریشاں خیالی کی باتیں نہ کیا کرو۔ صوفیائے کرام میں جو صوفی جلووں پر جلوے دیکھے اور اُف تک نہ کرے یا شاعروں کی زبان میں جو میکش خم پہ خم لنڈھا جائے اور آپے سے باہر نہ ہو وہ بلند مرتبہ گنا جاتا ہے۔ سعدیؒ نے اسی مضمون کو اس طرح لکھا ہے اور فارسی میں لکھا ہے ؎

اے مرغ سحر عشق ز پروانہ بیاموز
کاں سوختہ جاں شد و آواز نیامد

یعنی اے سحر کو بولنے والے پرندے! عشق پروانے سے سیکھ۔ اس سوختہ جاں کی جان چلی جاتی

لہ یہ غالباً میرے ان غمگین کلمات کی طرف اشارہ ہے جو میں نے شاہ جی کی قبر پہ اپنے خط میں جذباتی انداز میں تحریر کیے تھے

ہے لیکن آواز نہیں نکلتی اور تجھے خدا جانے کچھ نظر آتا ہے یا نہیں لیکن تو شور کرنے لگا ہے یہ بلبل سے خطاب ہے۔

اب یہاں تمہارا انتظار ہے تمہیں کب چھٹی ہوگی اور تم یہاں آوگے؟

کاتب کو گوجرانوالہ خط لکھوا دیا ہے کہ بندۂ خدا! عید سے پہلے کتاب لکھ کر پہنچا دے۔ کیوں تو نے اسے گروی رکھ لیا ہے؟ ورنہ عید کے بعد آدمی بھیجوں گا۔ آج کل کسی کتاب کا شائع کرنا بھاری اخراجات کے علاوہ جوئے شیر لانے سے کم نہیں۔

مجھے امید ہے تم خیریت سے ہوگے۔ اگر تم کچھ پتے بھیج دیتے تو میں ان پر پرچہ بھیج دیتا۔ پرچہ کافی لیٹ ہوگیا ہے۔ شاید ایڈیٹر صاحب کا غصہ ابھی تک ٹھنڈا نہیں ہوا۔ بھائی تم راجپوتوں سے خدا کی پناہ۔

اپنی خیریت لکھ دو اور اگر بھائی! رائے ونڈ وغیرہ کا کوئی پروگرام نہ ہو تو ایک آدھ دن پہلے ہی آجائیو۔ آخر تمہیں یہاں ایک آدھ دن رکنا تو پڑے گا۔ ساہیوال سے سیدھی کوئی گاڑی سرگودھا نہیں جاتی۔ بہت بہت پیار۔ والسّلام [۱]

تاج محمود غفرلہٗ

---

[۱] اگست ۸۲ء میں راقم الحروف نے ساہیوال کے ایک فنّی ادارہ میں داخلہ لے لیا تھا اور وہیں ہاسٹل میں رہائش اختیار کی تھی۔ مولانا کا یہ خط ہاسٹل ہی کے پتہ پر مجھے ملا اور اس پر تاریخ درج نہیں ہے مگر اس خط کے لفافے پر ڈاک کی مہروں سے پتہ چلتا ہے کہ یہ ۲۳ ستمبر ۸۲ء کو فیصل آباد سے پوسٹ ہوا اور ۲۶ ستمبر ۸۲ء کو مجھے موصول ہوا۔

۷

۱۰ر اکتوبر ۸۲ء

عزیزم زاہد سلمہ اللہ تعالیٰ

السلام علیکم - عزیزم! نزلہ بخار میں مبتلا ہوں اور پھر اس حالت میں جمعرات کو گکھڑ کا سفر کرنا پڑا۔ جسٹس[1] رفیق تارڑ کے بھتیجے اور نسیم صاحب (ایس۔ پی جھنگ) کے چھوٹے بھائی کی وفات کے سلسلہ میں جانا ضروری تھا۔ وہاں غم کیا! قیامت کا ماحول تھا۔ تارڑ صاحب کے بھائی کا ایک ہی بچہ تھا۔ لاہور انجینئرنگ کالج کا طالب علم تھا اور نسیم صاحب کا چھوٹا بھائی میڈیکل کے سال سوم کا گولڈ میڈلسٹ طالب علم تھا۔

اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ

پہلے ہی طبیعت خراب تھی۔ سفر اور غم کے ماحول نے چارپائی پر ڈال دیا۔ ابھی بھی بخار سے نبرد آزما ہوں۔

تم میری ساری باتوں کے معنی نہ نکالا کرو تم مجھے اپنے طارق کی طرح عزیز ہو اگر کوئی بات تمہارے خیال کے مطابق تلخ ہوا کرے (حالانکہ وہ تلخ نہیں ہوتی) تو اسے بھول جایا کرو[2]۔ دعا کریں میری طبیعت بحال ہو جائے۔

---

[1] جسٹس رفیق تارڑ صاحب (حال رکن پاکستان الیکشن کمیشن) مولانا کے قریبی دوستوں میں سے ہیں۔
اس سفر سے واپسی کے بعد جب میری مولانا سے ملاقات ہوئی تو مولانا کی صحت پر اس غم کا خاصا اثر محسوس ہوا۔ بار بار اس حادثے کا تذکرہ کرتے اور غمزدہ ہو جاتے تھے اس کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ مولانا انتہائی حساس طبیعت رکھنے والے ہمدرد انسان تھے۔

[2] ان دنوں راقم الحروف اپنی پریشانیوں اور راہ حیات کی دشواریوں کے سبب بہت زیادہ پریشان رہنے لگا تھا۔ اس وجہ سے مولانا کی بعض باتیں بھی طبیعت پر گراں گزرتی تھیں۔ حالانکہ وہ محض میرا احساس ہوتا تھا اور مولانا دانستہ کبھی کسی کا دل دکھانے والی بات نہیں کیا کرتے تھے۔

یہ خط بھی کسی سے لکھوانے کا خیال تھا لیکن خود بڑی مشکل سے لکھا ہے۔ زیادہ سوچنا اور کڑھنا تمہیں خراب کرے گا زیادہ سوچا نہ کرو۔

نیازی صاحب اور دوسرے عزیزان کو سلام مسنون عرض کردیں۔ میں تمہاری بھلائی بہتری اور دینی اور دنیوی کامیابی کے لئے اللہ پاک کے حضور دست بدعا ہوں۔ والسّلام

دعاگو۔

تاج محمود غفرلہ



عزیزم زاہد منیر سلمہ اللہ تعالیٰ

آپ کا خط ملا۔ اس دفعہ آپ آئے تو مجھے ڈاکٹر صاحب نے گھر سے دُور ایک دوست کی کوٹھی میں کچھ دن کے لئے نظر بند کر رکھا تھا[1]۔ مقصد یہ تھا کہ پوری توجہ سے علاج ہو سکے اور چند دن

---

[1] یہ وہ وقت تھا جب مولانا اپنی آخری منزل کی جانب تیزی سے رواں دواں تھے۔ اسی وجہ سے ڈاکٹر حضرات اور اعزّہ و اقارب مولانا کو مکمل آرام کا مشورہ دیا کرتے تھے مگر مولانا اپنی افتادِ طبع کے باعث سکون سے ناشناس ہی رہے۔ شدید علالت اور اس کے بعد بھی مولانا کی سرگرمیوں کا یہ عالم تھا کہ صبح ۹ وس بجے سے لے کر رات نو بجے تک (بسا اوقات گیارہ بھی بج جاتے) مسلسل کام کرتے۔ آنے جانے والوں کے مسائل سنتے۔ ان کی تکالیف کے انسداد کے لئے سعی کرتے اور جو کہیں لے جانا چاہتا اس کے ساتھ چلے جاتے اور اعلیٰ افسروں سے لے کر چھوٹے اہل کاروں تک سے عوام کے کام کرنے کی سفارش کرتے۔ علماء کی سطح کے مسائل اور مجلس تحفظِ ختمِ نبوت کی ذمہ داریاں، لولاک کا انتظام ان سے الگ تھا۔ غرضیکہ مولانا سارا دن شدید مصروفیات کے عالم میں گزارتے اور بعض اوقات رات کو اگر کوئی ہنگامی نوعیت کی اطلاع آجاتی تو مولانا کا شب بھر کا سکون بھی غارت ہو جاتا تھا۔ ان دنوں چونکہ مولانا طویل عارضۂ قلب سے نئے نئے صحتیاب ہوئے تھے اس لئے ڈاکٹر صاحب مولانا کو بار بار آرام کی تلقین کرتے تھے۔ جب انہیں اپنی اس تلقین کا کوئی اثر ہوتا نظر نہ آیا تو انہوں نے مولانا کو ان کے ایک عزیز کے گھر بطور مہمان لے جا کر ٹھہرا دیا کہ جب تک آپ اپنے گھر رہیں گے آرام نہیں کریں گے۔ جہاں چند روز رہ کر مولانا واپس اپنے گھر چلے گئے اور پھر وہی معمولات دوبارہ شروع ہو گئے۔

آرام و سکون کے بھی مل جائیں۔ اصل میں تو مجھے نزلہ ہوا تھا جو بگڑ گیا اور اتنا بگاڑ پیدا ہوا کہ سانس اُکھڑنے لگا اور ساتھ ہی دل کا مرض بھی جاگ اٹھا۔ تمہیں دیکھ کر دو تین باتوں کی پریشانیاں لاحق ہوئیں۔ ان میں سے مجھے جس بات سے تشویش ہے وہ آپ کی صحت کا مسئلہ ہے۔ خود میرے ساتھ بھی بالکل یہی حادثہ پیش آیا۔ آپ کو انفلوئنزا (سخت قسم کا نزلہ) ہوا جس کے بعد نہ تو مناسب دوائی کھائی گئی اور نہ آرام مل سکا حالانکہ یہ دونوں چیزیں سخت ضروری تھیں۔ تم نے لکھا ہے کہ ابھی تک نزلہ کھانسی باقی ہے۔ یاد رکھیئے کہ ANTI BIOTIC ادویات نزلے کو دبا دیتی ہیں، خشک کرتی ہیں اور جلا دیتی ہیں لیکن اچھی قسم کا دیسی جوشاندہ اس کو خارج ہونے کے قابل بنا کر باہر نکال دیتا ہے جو چیز دماغ پہ جمی ہو اس کو ناک کے ذریعے اور جو چھاتی پر گر کر منجمد ہو چکی ہو اسے گلے اور تھوک کے ذریعے خارج کر دیتا ہے۔ آپ نے کسی ایک نوعیت کا علاج نہیں کیا۔ میری اب بھی رائے یہی ہے کہ اگر چند دن آرام مل سکتا ہو تو صبح، دوپہر اور رات کو سوتے وقت جوشاندے پیئں تاکہ یہ منجمد نزلہ آپ کے پھیپھڑوں اور دماغ سے خارج ہو جائے۔ آخری سٹیج پر کوئی انگریزی دوائی کھالیں تو کوئی حرج نہیں ہوگا۔ تمہاری صحت کی ویرانی میں اس بوجھ کا اثر بھی ہے جو تعلیمی پریشانی کے سبب آپ کو لاحق ہے حالانکہ میں نے آپ کو لکھا تھا کہ آپ زیادہ سوچنا، کڑھنا اور زیادہ پریشان ہونا بالکل چھوڑ دیں۔ آپ کا جسم ان بلاؤں کا متحمل نہیں ہو سکتا۔

کتاب کے جتنے صفحات آئے الحمدللہ بہت اچھے لکھے ہوئے آئے ہیں۔ آپ کے کہنے کے مطابق کاتب کو خط لکھ دیا ہے کہ اگر شاہ صاحب پر تحریری کام والے صفحات تاحال کتابت نہ ہوئے ہوں تو ان کے لکھنے سے ہاتھ روک لیں اور ہمیں مطلع کریں اور ہماری دوسری ہدایت کا انتظار کریں۔

میں پھر ایک دفعہ تاکید کروں گا کہ سب سے پہلے اپنی صحت کی بحالی کی طرف توجہ دو تاکہ صحت ٹھیک ہو۔ گھی والی چیزیں کھانا چھوڑ دو۔ بہتر ہے کہ گندم کا دلیہ کم دودھ ڈال کر بنوا لیا کریں۔ زیادہ سے زیادہ کوئی نمکین چیز اوپر سے زبان کا ذائقہ بدلنے کے لئے چکھ لیا کریں۔

نیازی صاحب محترم اور اہل خانہ کو درجہ بدرجہ سلام مسنون عرض کر دیں۔

دُعاگو۔

تاج محمود عفرلہٗ

---

(۹)

۹ نومبر ۸۲ء

فیصل آباد

عزیزم زاہد منیر صاحب!

السلام علیکم۔ آپ کا خط مل گیا حالات سے[۱] آگاہی اور اطمینان ہوا۔ گوجرانوالہ کے کاتب نے مسودہ مکمل کر کے بھیج دیا ہے۔ البتہ شاہ جیؒ پر ہونے والے تحقیقی کام[۲] کے اوراق ویسے ہی واپس بھیج دیئے ہیں۔ ان میں جو کچھ کرنا ہے کرو۔ اگر کہو تو ساہیوال رجسٹرڈ پارسل کے ذریعے بھیج دُوں۔ مجھے لائنیں بلانی نہیں چھوڑیں ورنہ میں بھی ابتدائی چند سطریں تحریر کرا دوں

قاری صاحب اور ان کے صاحبزادے ڈاکٹر[۳] صاحب سے سلام نیاز عرض کر دیں والسّلام

دعاگو۔ تاج محمود عفرلہٗ

---

[۱] امیر شریعت پر اب تک ہونیوالا تحریری کام، یہ کتاب "سید عطاء اللہ شاہ بخاری اور پاکستان" کا ایک باب ہے جس میں شاہ جیؒ پر لکھی جانے والی تمام کتب اور مضامین کا تذکرہ و تجزیہ کیا گیا ہے۔ میں جب کتاب لکھ چکا اور مسودہ کاتب کے سپرد کر دیا گیا تو اس کے بعد شاہ صاحبؒ سے متعلق بعض ایسی مطبوعات کا علم ہوا جو پہلے میری نظر سے نہ گزری تھیں چونکہ مذکورہ باب میں شاہ جیؒ پر لکھی جانے والی تمام تصانیف اور مضامین کا تذکرہ مقصود تھا اس لئے میں نے مولانا سے کہہ کر اس باب کی کتابت رکوا دی اور مسودہ واپس منگوا کر اس میں اضافہ کرنے کے بعد پھر کاتب کے سپرد کیا گیا۔

[۲] ساہیوال میں میرے میزبان قاری عبدالغنی صاحب خطیب جامع مسجد غلہ منڈی اور ان کے صاحبزادے قاری حفیظ الرحمن صاحب کا ذکر ہے۔

آج شاہد صاحب[1] آئے، ملے لیکن نہ کھانا کھایا اور نہ چائے پی کہیں انٹرویو دینے جانا تھا
دوسری مرتبہ آیا، کھانا تیار کروایا تھا لیکن کہنے لگے "بھوک بالکل نہیں"۔ کچھ تکلف برتا۔
بڑا اچھا لڑکا ہے اور شائستہ عادات و خصائل ہیں پہلے وہ صفحات میں انہیں رہا تھا
پھر سوچا اِمتحان سے فارغ ہو جاؤ۔ مائیگریشن کی مبارک ہو[2]

---

(۱۰)

عزیزم زاہد سلمہٗ اللہ تعالیٰ[3]

السلام علیکم۔ مجھے بہت افسوس اور دکھ رہا کہ میں نے تمہیں بیماری اور بخار کی حالت میں
بھیج دیا۔ اصل میں عید تھی اور گھر والوں کی پریشانی کا اندیشہ تھا۔ اب طبیعت کیسی ہے، بخار اتر گیا ہو گا (انشاء اللہ)

۱؎ راقم الحروف کے بڑے بھائی جناب شاہد منیر چوہدری صاحب (فارماسسٹ) کا ذکر ہے۔ جن سے اس ملاقات کے
بعد مولانا کو خاص اُنس پیدا ہو گیا تھا۔

۲؎ میں طویل عرصے سے کوشاں تھا کہ ساہیوال کے فنی ادارے سے سرگودھا منتقل ہو جاؤں۔ مگر اس راہ میں بعض
پیچ در پیچ مشکلات حائل رہیں۔ بالآخر اکتوبر ۸۲ء کے اواخر میں میرا تبادلہ سرگودھا ہو گیا۔ مولانا ساہیوال کے قیام میں
میری کشور اریوں سے آگاہ تھے۔ اس لئے انہوں نے یہ مبارک باد لکھی۔

۳؎ ستمبر ۸۲ء میں عید الفطر کی تعطیلات کے دوران میں ساہیوال سے سرگودھا آتے ہوئے مولانا کے پاس ٹھہرا
تو اتفاق سے مجھے بخار نے آن لیا۔ دو چار روز گذر گئے مگر میں بستر سے نہ اٹھ پایا۔ اس دوران مولانا نے جس طرح
محبت اور شفقت کا مظاہرہ فرمایا وہ میرے لئے تا عمر سرمایہ حیات رہے گا۔ مولانا ہر لحظہ میرا خیال رکھتے۔ مجھے
خود دوا کھلاتے اور ڈاکٹر کے پاس بھی خود لے کر جاتے تھے۔ ادھر میں مولانا کے آرام میں خلل انداز ہونے کے احساس
سے نادم رہتا۔ میں اصرار کرتا کہ مجھے سرگودھا بھیج دیں مگر مولانا کہتے کہ ذرا صحت سنبھل جائے تو پھر جانا۔ خدا خدا
کر کے میری طبیعت کچھ بہتر ہوئی۔ میں نے فوراً سرگودھا آنے پر اصرار کیا آخر مولانا نے مجبور ہو کر مجھے اجازت دے

مجھے ڈر تھا کہ کہیں میعادی بخار نہ بن جائے۔ مطلع کر دیں۔

نیازی صاحب ، زید مجدہم ، کا خط ، حافظ کے ہاتھ آیا ۔ انہوں نے شکریہ لکھا تھا حالانکہ اس کی ضرورت نہ تھی ۔ یہ میرا اخلاقی فرض تھا ۔ مجھے تم اپنے طارق محمود کی طرح عزیز ہو ۔ میری دعا یہ ہے کہ جو صلاحیتیں حق تعالیٰ نے تمہیں فطری طور پر ودیعت فرمائی ہیں وہ احسن شکل میں بروئے کار آئیں ۔ اور تمہیں دین و دنیا کی کامرانی نصیب ہو ۔ جتنا ہو سکے تیزی طبع پر کنٹرول کرو ۔ اپنے لئے زندگی کی ایک راہ متعین کرو اور اس پر گامزن رہو ۔

نیازی صاحب کی خدمت میں سلام مسنون اور انہیں کہئے کہ میرے لئے سلامتیِ ایمان و صحت کی دعا فرمایا کریں ۔ اپنی خیریت سے جلد مطلع کرنا مجھے تشویش ہے ۔ گھر میں سب کو سلام مسنون اور دعائے برکت ۔ والسلام

دعا گو ۔ تاج محمود غفرلہٗ

۱۱

۳۰ نومبر ۱۹۸۲ء

عزیزم زاہد منیر!

السلام علیکم ۔ آپ کا خط ملا اور آج ہی تمہارے کہنے کے مطابق جواب تحریر کر رہا ہوں ۔ بیٹا! "تو فکر نانے داری و من فکر جہانے دارم" یہ سعدیؒ کی عبارت ادنیٰ تصرف سے لکھی ہے کہ تجھے صرف ایک روٹی کی فکر اور مجھ کو ایک جہاں کی فکر ہے ۔ ؎ تم کا معالج سرگودھا میں کوئی نہ ملے تو یہاں آ جانا

؎ دی اور اپنی مسجد کے امام صاحب کو میرے ساتھ بھجوایا اس طرح وہ مجھے سرگودھا ، گھر تک پہنچا کر گئے ۔ حافظ صاحب (جو مجھے سرگودھا چھوڑنے آئے تھے) کو جاتے ہوئے میرے بھائی صاحب قبلہ حبیب الرحمن نیازی ایڈووکیٹ نے مولانا کے نام ایک شکریہ کا خط بھی دے دیا تھا جس کا مولانا نے اس خط میں ذکر کیا تھا ۔ یہ خط میرے فیصل آباد سے واپس آنے کے چند روز بعد مجھے سرگودھا میں ملا ۔

میں ہی تیرے مرض کا علاج تجھے چنگا بھلا کر دوں گا۔

مجھے معلوم تھا زاہد کا خط آئے گا اور اس کا مضمون یہ ہوگا۔ خدا کے واسطے دل سے وہم نکال دو تم میرے ایسے ہی بیٹے ہو جیسے طارق محمود ہیں۔ ممکن ہے میرے دل کے گوشے میں کوئی بوجھ ہو لیکن اخلاص قائم تھا تو وہ آپ پر ظاہر ہوا۔ نفاق ہوتا تو آپ پر کیفیت ہی نہیں کیفیات کا انکشاف کیوں ہوتا[1]

بیٹا! اطمینان رکھو اور یہ خود ساختہ کیفیات یا خود ساختہ نہ سہی۔ اپنی حساس طبیعت کی واردات اپنے اوپر طاری نہ کرو۔

جو صفحات درست کر کے مجھے بھیجے ہیں ذرا جلدی بھیج دیں اور اگر کسی چھٹی والے دن مثلاً جمعرات کو آجائیں اور جمعہ کو واپس چلے جائیں تاکہ مسودہ پر ایک نظر ڈال کر مشورہ کر لیا جائے تو بہتر ہوگا امید ہے تمہارا دل صاف ہو گیا ہوگا ورنہ ٹسرف اسے دھونا پڑے گا۔ والسلام

تاج محمود غفرلہ

۱۲

پیارے بیٹے زاہد سلمہ اللہ تعالیٰ

السلام علیکم۔ امید ہے آپ خیریت سے ہوں گے آپ کا خط مل گیا۔ کتاب میں نے پڑھ لی ہے۔ کئی جگہ ایسی غلطیاں ہیں جو سمجھ میں نہیں آتیں کہ اصل لفظ کیا ہے تمہارا مسودہ اسی روز رجسٹرڈ گوجرانوالہ بھیج دیا تھا خیال یہ تھا کہ اگر کاتب کام جلدی کر دے تو کانفرنس کے موقع پر[2] کچھ کتاب نکل جاتی۔ کل کاتب کو پھر خط لکھتا ہوں اور اس کے مکمل کر لینے پر

---

[1] اس کی وضاحت مکتوب نمبر ۲ کے حاشیہ میں گزر چکی ہے۔

[2] آل پاکستان تحفظ ختم نبوت کانفرنس چنیوٹ ۲۶، ۲۷، ۲۸ دسمبر ۸۲ء مراد ہے۔

حنیف صاحب کو بھیج دوں گا یہ غلطیاں بھی لگوائیں گے اور کاپیاں بھی جڑ جائیں گے پریس والے نے کہا ہے کہ میں فوراً چھاپ کر کتابیں آپ کی ضرورت کی بنوا دوں گا۔

غالباً مسودہ کی کاپی آپ لے گئے تھے۔ ایک آدھ غلطی کتابت میں عجیب ہے مثلاً امام اللہ خاں ناصر کے اشعار میں آخری شعر ؎

ابر رحمت بن کے برسے آرزو کی کشت پر حسرتوں کی آگ دل میں دھواں پیدا کرے[1]

اسی طرح عدم کی نظم میں ساتواں شعر بے معنی لکھا ہوا ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔

اصل نظمیں میرے پاس بھی ہوں گی مگر میرے لئے تلاش کرنا کارِ دارد۔

دعاگو ۔

تاج محمود غفرلہٗ

۸ / دسمبر ۸۲ء

---

(۱۳)

عزیزم زاہد منیر سلمہ اللہ تعالیٰ۔

السلام علیکم۔ ارادہ تھا کہ آپ کو آج فون کروں گا لیکن حضرت مولانا عبدالواحد صاحب خطیب گوجرانوالہ گزشتہ سے پیوستہ روز قضائے الٰہی سے وفات پا گئے تھے۔ مجھے دیر سے خبر ہوئی۔ ۱۰ بجے صبح جنازہ تھا۔ میں شریک نہ ہو سکا۔ آج ہمدانی صاحب[2] کے ہمراہ نکل جانے کا ارادہ ہے۔ مسودہ کی غلطیاں لگ چکی ہیں۔ وہ ہمراہ لے جاؤں گا اور کاتب

۱؎ درست شعر ایسے ہے

ابر رحمت بن کے برسے آرزو کی کشت پر حسرتوں کی آگ دل میں وہ دھواں پیدا کرے

۲؎ مولانا محمد اشرف ہمدانی خطیب جامع مسجد جناح کالونی فیصل آباد

کو غلطیاں لگانے کے لئے دے آؤں گا تاکہ وہ کاپیاں بھی جوڑ دے گا۔ اس میں دو چار روز لگ جائیں گے جس دن کا اس نے وعدہ کیا اس دن مولانا حنیف صاحب لے آئیں گے۔

کل پریس پر خود گیا تھا۔ کئی قسم کے کاغذ تھے۔ فیصلہ ہوا کہ چار سدہ کا سفید کاغذ ۵۶ گرام والا لگایا جائے۔ مولانا ضیاء القاسمی والی کتاب[1] آپ نے دیکھی ہے، کاغذ کی دوسری طرف بھی الفاظ نظر آتے ہیں۔ اس دبیز کاغذ کے دو فائدے ہوں گے۔ ایک تو ماشاء اللہ خوب سفید ہے، دوسرا کتاب ضخیم ہو جائے گی۔ اب اور عجیب بات سنیئے اس کاغذ کے لگانے سے ۱۰۰۰ کتاب پر پرنٹنگ اور کاغذ پر تقریباً ۲۵۰/- روپئے خرچ آئیں گے۔ اس سے اگلا مرحلہ حیران کن ہے کہ وہ جلد جو ہمارے ذہن میں ہے اس پر ۱۰۰۰ کتاب کے حساب سے ۵۰۰/- روپیہ خرچ اٹھے گا۔ یعنی داڑھی سے مونچھیں دوگنا ہوں گی پریس والے کا مخلصانہ مشورہ یہ ہے کہ آپ پتلا گتہ مائٹیل ہمیں لگانے دیں۔ بڑی حد ہے تو آرٹ پیپر کا کور علیحدہ چھپوا کر اوپر چڑھا دیں (جیسا تم بنا کر دے گئے تھے) اس کا خرچہ بھی قابل برداشت ہوگا۔

مولانا حبیب اللہ صاحب والے مضمون میں میں نے قلم لگایا ہے اور اسے مزید موزوں کر دیا ہے۔ تمہارے مضمون حدیثِ دل' کا خاصا اپریشن کرنا پڑا۔ کتاب میں ختم نبوت پر جو آپ نے کرم فرمائی کی اس کے چند سطریں لکھ دی ہیں (جہاں چند سطریں خالی چھوڑی ہوئی تھیں[2]) شاہ صاحب یا ان کے رفقا نے مجلس احرار کو کبھی بھی ختم نہ کیا تھا۔ البتہ شاہ جیؒ مجلس احرار سے عملاً یہ کہہ کر الگ ہو گئے تھے کہ الیکشن میرے لئے سؤر کی بوٹی ہے۔ مجلس احرار پر حکومت نے پابندی لگائی تھی۔ شاہ جیؒ اور ہم سب نے اس کے واگزار ہونے پر خوشی کا اظہار کیا تھا اور شاہ جی نے ملتان کے دفتر پر جھنڈا لہرایا تھا اور دعا کی تھی۔ حقیقت یہ

---

[1] خطبات قاسمی جلد اوّل

[2] میں نے جب "سید عطاء اللہ شاہ بخاری اور پاکستان" کے مسودہ کو آخری شکل دی تو "قیام پاکستان کے بعد" والے باب میں مجلس تحفظ ختم نبوت کے قیام کے بارے میں مناسب اور مستند معلومات نہ ملنے کی وجہ سے کچھ جگہ اس خیال سے خالی چھوڑ دی تھی کہ مولانا تاج محمود سے متعلقہ معلومات حاصل کر کے یہاں تحریر کروں گا۔ یہ اسی عرض اور خالی جگہ کا تذکرہ ہے۔

ہے کہ مجلسِ احرار میں دو قسم کے ذہن تھے۔ ملک تقسیم ہو جانے کے بعد ایک شاہ جی کی طرح کے لوگ جو خالص دینی لوگ تھے اور جو آئندہ اس ملک میں سیاسی کام نہیں کرنا چاہتے تھے۔ مسلمانوں میں نزاعی اور متصادم ہو کر باقی وقت نہیں گزارنا چاہتے تھے۔ اور کچھ دوسرے جو خالصتاً سیاسی لوگ تھے وہ اپوزیشن یا کسی بھی حیثیت سے کام کرنا چاہتے تھے۔ پہلے تو دونوں گروہوں نے مجلسِ احرار کو غیر سیاسی قرار دیا۔ اور جو لوگ سیاسی کام کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتے تھے انہیں لیگ کے پلیٹ فارم سے کام کرنے کی اجازت دی گئی۔ مسلم لیگ نے انہیں بوجوہ قبول نہ کیا تو زعمائے احرار ملتان شاہ جیؒ کے گھر جمع ہوئے یہ عاجز بھی اس میٹنگ میں شریک تھا۔ یہ میٹنگ شاہ جی کے گھر رات کے وقت مکان کی چھت پر ہوئی تھی تو سیاسی لوگوں نے عوامی لیگ میں شمولیت کے ارادے کا اظہار کیا۔ جس کے بعد اتفاق اور محبت سے جماعت کے دو ذہنوں کو الگ الگ کر دیا گیا۔ جنہوں نے سیاسی کام نہیں کرنا وہ مجلس تحفظِ ختمِ نبوت میں شامل ہوں گے۔ شاہ جی، مولانا محمد علی جالندھری، قاضی احسان احمد شجاع آبادی، مولانا لال حسین اخترؒ، مولانا عبدالرحیم اشعرؒ، مولانا محمد شریف جالندھری، مولانا مجاہد الحسینی، مولانا علاؤ الدین ڈیروی، مولانا نذیر حسین ہنوں عاقل اور یہ عاجز مجلس تحفظِ ختمِ نبوت میں احرار کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے چھوڑ کر شامل ہو گئے۔ شیخ حسام الدین، ماسٹر تاج الدین انصاری اور احرار کارکنوں کی ایک بہت بڑی تعداد مجلسِ احرار میں شامل رہتے ہوئے سہروردی صاحب کے ہاتھ پر بیعت کر کے عوامی لیگ میں شامل ہو گئی لیکن اس ہانڈی میں بھی یہ بوٹیاں گل نہ سکیں۔

مجلسِ تحفظِ ختمِ نبوت کے بانی مبانی اصل شاہ صاحب تھے جو الیکشنی سیاست کو سور کی بوٹی کہتے تھے۔ اور کہتے تھے کہ آئندہ میں یہ سور نہیں کھاؤں گا۔ جو شوق رکھتا ہے وہ جہاں مرضی ہے جائے۔ تاہم ساری زندگی کے ساتھی تھے دل میں کوئی کدورت نہ رکھتے تھے۔ آپس میں میل محبت تھی۔ آپس میں عناد رکھنا، ساتھیوں کی کردار کشی کرنا اور صلواتیں سنانا یہ عقدہ تو آگے کچھ اور لوگوں پر ہوا۔

ایک بات بھول گیا۔ جب رات کو شاہ جی کے مکان پر چھت پر میٹنگ میں دو علیحدہ علیحدہ جماعتیں بنانے کا فیصلہ کیا گیا تو مجلس کے املاک تقسیم ہوئے۔ کراچی کوئٹہ۔ لاہور کا دفتر، گوجرانوالہ کا

دفتر جو ہم نے مجلس تحفظِ ختمِ نبوت کے فنڈ سے خریدا تھا یہ دفاتر مجلس کے حصہ میں آئے۔ شاہ محمد غوث کے بالمقابل جہاں ماسٹر تاج الدین انصاریؒ کی اوپر رہائش اور نیچے دفتر تھا وہ احرار کے حصہ میں آیا۔

شاہ جیؒ ملک کی تقسیم کے بعد نہ صرف سیاسیات اور الیکشنوں سے دستکش ہو گئے بلکہ مجلس تحفظِ ختمِ نبوت کے پہلے امیر منتخب ہوئے اور آخر دم تک اس کے امیر ہی رہے۔ ان کی وفات کے بعد قاضی احسان احمد مرحوم، ان کی وفات کے بعد مولانا جالندھری، ان کی وفات کے بعد مولانا لال حسین اختر اور ان کی وفات کے بعد شیخ الاسلام سید محمد یوسف بنوریؒ جن کی وفات کے بعد اب مولانا خان محمد صاحب امیر ہیں۔ شاہ جیؒ کے لگائے ہوئے پودے کو جاری ہزار قباحتوں کے باوجود اللہ نے برکتیں دیں۔ وہ پھول پھل رہا ہے۔ دوسری طرف کا میں کچھ نہیں کہتا۔

آپ نے احرار اور شاہ جیؒ کی تاریخ لکھی ہے۔ کتابیں پڑھ کر لکھی ہے اور ہم وہ سراپا تاریخ اور حسرتوں کے لاشے ہی سہی لیکن ابھی زندہ ہیں۔

بہرحال آپ نے محنت کی ہے۔ اپنے سن و سال سے کہیں بڑھ کر کی ہے۔ یہ مفید ہیں ایک مغالطہ اور غلط فہمی تھی جو دور کرنے کی کوشش کی۔ آپ کے قلم سے شاہ جیؒ کی عظمت کو سلام کرتے ہوئے یہ بھی ذہن سے نکل گیا کہ انہوں نے نہ صرف احرار کو ختم کیا بلکہ محمد علی جالندھری کو مجلس تحفظِ ختم نبوت کا پہلا صدر بنا دیا۔ مجھے اس کی بھی وضاحت کرنا پڑی کہ دونوں باتیں غلط ہیں۔ اصل واقعات وہ ہیں جو عاجز نے اوپر درج کئے ہیں۔

اصل خط تو کتاب کی طباعت اور جلد سازی کے لئے لکھا تھا۔ ایک اور بات بھی لکھنا چاہتا ہوں مگر تمہاری حساس طبیعت سے توقع ہے کہ تم اس بات کا بھی بتنگڑ بنا دو گے اور میری کسی ناراضگی پر محمول کرو گے۔ اور خصوصاً اس خط کے مندرجات سے جو میں نے ایسے ہی صحیح واقعات کی نشاندہی کے لئے لکھ دیئے ہیں۔ ابھی فجر کی اذان نہیں ہوئی۔ ذہن میں یہ باتیں آئیں لکھ دیں۔ دن کو اتنا لمبا خط لکھنے کا موقع کب ملتا ہے اگر سوچ میں پڑ جاتا ہوں اور پہلے کی طرح کوئی خط لکھ مارتا ہوں تو میں خاموش رہتا ہوں۔ اور اگر تمہیں یقین ہے کہ میرا آپ سے تعلق اور شفقت رضائے الٰہی اور ایک ہونہار بچے کے نیک مستقبل کے لئے ہے تو

ابھی کہہ دوں ۔ وہ یہ ہے کہ مجھ سے اس کتاب میں کچھ نہ لکھواؤ ۔ میرے لکھنے کا فائدہ کم اور نقصان زیادہ ہوگا۔ میں نے طبیعت کو اس طرف مائل کرنے کی ہر چند کوشش کی ہے ، طبیعت مائل ہی نہیں ہوتی ۔ اگر میری یہ بات اپیل کر جائے اور دل شکنی محسوس نہ کرو تو کتاب خواہ لیٹ ہو جائے اس کا دیباچہ سید محمد عبداللہ ہی کو لکھنا چاہیئے تھا[لے] ۔ اگر وہ نہیں لکھتے تو کوئی اور موزوں غیر متنازعہ فیہ شخصیت کی طرف رجوع کریں ۔ اصل میں گمنامی میں زندگی بسر کی ہے ۔ خود نمائی کی عادت نہ کبھی تھی نہ اب ہے ۔ دل نہیں مانتا ، اب مستقبل بتلائے گا کہ میرے یہ کلمات کسی نا راضگی کے باعث نہیں ۔ میری دلی شفقتیں آپ کے ساتھ رہیں گی ۔ متعلقین کو سلام مسنون والسلام ۔

دُعاگو ۔ تاج محمود غفرلہٗ

لے ابتداءً میں خیال تھا کہ کتاب کا دیباچہ ڈاکٹر سید محمد عبداللہ اور مقدمہ مولانا تاج محمودؒ تحریر کریں گے ۔ اس سلسلہ میں ڈاکٹر سید محمد عبداللہ صاحب سے بات ہوئی تو انہوں نے اپنی نظر کی کمزوری کی بنا پر کہا کہ جب کتاب کی ڈمی تیار ہو جائے تو اس کی ایک کاپی مجھے بھیج دینا ۔ میں جلد بندی سے پہلے آپ کو دیباچہ لکھ کر بھیج دوں گا ، تاکہ آپ اسے الگ کاپی پر طبع کرواکر جلد میں شامل کریں مگر جب کتاب شائع ہوئی تو پہلے ہی اس قدر تاخیر ہو چکی تھی کہ اب مزید تاخیر کا حوصلہ نہیں تھا اس لئے محترم ڈاکٹر سید محمد عبداللہ صاحب کے دیباچہ کا خیال ترک کر دیا گیا ۔ البتہ مولانا تاج محمود سے مقدمہ لکھوانے کا ارادہ ابتداء سے ہی مستحکم تھا اور وہ کتاب کی طباعت کے جملہ لوازمات سے پیشتر لکھا جانا تھا ۔ اس لئے مولانا کی بار بار معذرت کے باوجود میں انہی سے مقدمہ لکھوانے پر مصر رہا اور بالآخر مولانا نے میری درخواست کو شرف قبولیت بخشتے ہوئے شاندار اور زوردار مقدمہ تحریر فرمایا جو اب کتاب میں شامل ہے ۔

۱۴

عزیزم زاہد منیر خاں عامر صاحب!

السلام علیکم ۔ مزاج شریف ۔ آپ کا عزیزکا دستی اور دوسرا بذریعہ ڈاک دونوں خط مل گئے ۔ اصل میں چار دن اور چار راتیں مجھے کانفرنس کے موقع پر بے آرامی رہی ۔ کانفرنس ختم ہوئی تو ایام نزلہ شروع ہو گئے گھر میں جس کو دیکھو نزلے بخار سے پڑا ہے ۔ کل پرسوں سے نزلہ کانفرنس سے نجات ہوئی ہے ۔ ابھی دو ایک بچے کھانسی بخار سے پڑے ہیں

کتاب علی حالہ ہے ۔ میرا مقدمہ اگر شامل کرنا ضروری ہو تو وہ لکھا جا چکا ہے ۔ تمہاری حدیث دل ' میں بطور احسان کے جہاں میرا نام تھا وہ میں نے کاٹ دیا ہے ۔ نہ ہی وہ میرے شایان شان ہے البتہ بیٹے ہونے کی حیثیت سے میری عقیدت اور شفقت کا ذکر کرنا ضروری ہو تو دو چار لفظوں میں کر دینا ۔ کتاب کا مواد مکمل ہے اور کتاب کے وسائل بحمد اللہ میرے پاس موجود ہیں ۔ غلطیوں کا لگوانا اور کاپیوں کا جڑوانا ایک ایسا مرحلہ ہے جو ہم میں سے کسی کی نگرانی چاہتا ہے ۔ یا میں دو دن گوجرانوالہ جا کر قیام کروں یا تم کالج کی مصروفیات سے فارغ ہو لو تو خود جاؤ ۔ نیز اس بات پر بھی غور کرنا ہے کہ جب اس کے جملہ مصارف میں ہمیں " واحسرتا " کا معاملہ درپیش نہیں تو ایک یہ بات سوچنے کی تھی کہ اگر یہ لاہور سے چھپ جائے اور وہیں کوئی اندرونی ٹائیٹل بنا دے ۔ بیرونی بے شک وہی رہے جس کی ہم تجویز کر چکے ہیں تو کیا حرج ہے ۔ اس سلسلہ میں دو چار روز کے لیئے گھر سے نکلنا پڑے گا ۔ دو دن گوجرانوالہ لگ جائیں گے اور ایک آدھ دن لاہور میں ٹھہر کر کم از کم کتاب کی ابتدائی سرخیاں نفیس صاحب سے لکھوائی جائیں ۔ مجھے معلوم نہیں آپ کالج میں مصروف ہیں یا اپنے دیرینہ رفیق کار کھانسی ، بخار سے مصروف پیکار ہیں ۔

آج یہاں دھوپ نکلی ہے ۔ خدا کا شکر ہے کہ چند سطریں حنیف صاحب سے لکھوائیں اور سپرد ڈاک کروائیں ۔ والسلام ۔

دعاگو۔ تاج محمود غفرلہٗ

برادرانِ مکرم کو سلام مسنون۔ خوشی ہوئی کہ آپ نے محترم غازی احمد صاحب کی زیارت کرلی۔ اگر اللہ کو منظور ہوا تو ہمیں بھی حاضری کی سعادت نصیب ہو جائے گی۔ انشاءاللہ[1]

گھر میں سب کو سلام۔ والسلام

تاج محمود غفرلہٗ

۱۰ ر جنوری ۸۳ء

---

(۱۵)

عزیزم زاہد منیر! اسلمٔ اللہ تعالیٰ

السلام علیکم۔ تمہارا ایک اور پھر دوسرا خط بھی مل گیا۔ گوجرانوالہ والے کاتب کو ہم نے "میٹر" بھیجنے میں تاخیر کی اس لئے خدا جانے وہ کسی اور کام میں لگ گیا یا کیا ہوا؟ تاحال اس کا جواب نہیں آیا۔ دوسری بدقسمتی یہ کہ مولانا حنیف صاحب بے چارے بخار میں مبتلا ہو کر بیمار پڑے ہیں۔ قابلِ رحم حالت ہو گئی ہے۔ ان کو گوجرانوالہ نہیں بھیج سکا۔ اور کسی کا جانا مفید مقصد نہ تھا۔ خیال تھا کہ وہ کام اگر وہاں سے ہو کر آجاتا تو یہ باقی "پیغامِ حبیب" اور "احسانِ محسن" یہاں سے کتابت کروا لیتے۔

---

[1] پروفیسر غازی احمد صاحب کو یہ شرف حاصل ہے کہ انہیں عالمِ رویا میں خاتم المرسلین آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مشرف بہ اسلام فرمایا۔ اور بعد ازاں انہوں نے ہمیشہ کے لیے ہندو دھرم کو ترک کر کے اسلام کی حلقہ بگوشی اختیار کر لی اور اب بہت سے دینی اور دنیوی اعزازات حاصل کرنے کے بعد تقریری و تحریری تبلیغ اسلام میں مصروف ہیں۔ مولانا نے اپنے ایک دوست سے غازی صاحب کے بارے میں سنا تھا اور وہ غازی صاحب سے ملنے کے بہت مشتاق تھے۔ اس چیز کا انہوں نے مجھ سے بھی ذکر کیا اور کہا کہ اگر ہمیں غازی صاحب کا اڈریس مل گیا تو ہم ان سے ملنے چلیں گے۔ اتفاق سے کچھ دنوں کے بعد غازی صاحب موصوف ایک پروگرام کے سلسلے میں سرگودھا تشریف لائے لیکن ان کے پروگرام کے مختصر ہونے کی وجہ سے مولانا کے ساتھ ان کی ملاقات کی سبیل پیدا نہ ہو سکی۔ میں نے یہ ساری تفصیل فون پر بتائی اور خط لکھا تو مولانا نے یہ جواب دیا۔

مع آپ کی حدیث تشریف دل کے احسان .... کو میں نے نظم میں اُٹھایا۔ میری مجال نہیں ہوتی حالانکہ میرے خیال میں انہوں نے بہت زیادتی کی ہے۔ دو کتابوں کی تعریف کی ہے۔ ایک جو نی زمانہ نہ کسی کو مِل سکتی ہے اور نہ کوئی نئی نسل کا شخص اسے پڑھ سکا ہے۔ دوسری کتاب پروفیسر خالد شبیر کی کتاب ہے۔ حالانکہ وہ اس کے ابّا جان نذیر مجیدی کے نام سے چھپی ہے اور وہ بھی انہوں نے لکھی نہیں بلکہ اِدھر اُدھر سے متعلقہ مواد جمع کیا ہے[1]۔ آپ کی حدیثِ دل پر قلم چلایا ہے۔ اس کا اپریشن کر کے اسے بالکل درست کر دیا گیا ہے۔ دل نہیں مان رہا لیکن حسبِ وعدہ راقم الحروف بھی کچھ لکھ دے گا۔

اب اور نئے پریس پر گیا تھا کاغذ کا فیصلہ کیا۔ چارسدہ کا سفید کاغذ ۵۶ گرام کا ذرا وزنی ہے طباعت ٹھیک آئے گی۔ کاغذ صاف اور سفید ہوگا۔ اور کتاب کی ضخامت بھی ذرا وزن دار ہو جائے گی۔

---

[1] ابن امیر شریعت مولانا سید عطاء المحسن بخاری صاحب نے میری کتاب پر اپنے دیباچہ میں حضرت شاہ صاحبؒ کے دیگر تمام سوانح نگاروں پر تنقید کرتے ہوئے لکھا ہے کہ "دو آدمی ایسے ہیں جنہوں نے تعلق خاطر رفاقت اور علم کی سنگت سے کچھ لکھا اور خوب لکھا۔ ان میں سرفہرست خاں غازی کابلی ہیں جو پاکستان بن جانے کے بعد دل کے ہو کر رہ گئے اور دوسرے جناب پروفیسر خالد شبیر صاحب" (صفحہ ۱۹)

اس بارے میں مولانا کا مندرجہ بالا موقف یہ ہے کہ خان کابلی کی کتاب جو کہ ۱۹۴۰ء میں پہلی اور آخری بار شائع ہوئی تھی، نئی نسل میں سے کسی نے نہیں پڑھی اور خالد شبیر صاحب کی کتاب موسومہ "شاہ جی" تصنیف نہیں ہے بلکہ اس میں شاہ جی پر مختلف حضرات کے مضامین اور اخبارات و رسائل کے اداریے جمع کئے گئے ہیں جو کہ نذیر مجیدی (خالد شبیر کے والد) کے نام سے شائع ہوئے ہیں۔ یہ کتاب ۱۹۶۵ء میں شائع ہوئی اور اب بالکل نایاب ہے۔ اس لحاظ سے جب شاہ جی پر لکھی جانے والی تحریروں کے قارئین یہ بھی نہیں جانتے کہ خالد شبیر صاحب نے شاہ جی پر کچھ لکھا بھی ہے یا نہیں پھر دوسرے افراد کی تحریروں سے ان کی کتاب کو ممیز کر کے کیوں پیش کیا گیا؟

مولانا کے اس موقف میں ذاتیات کو قطعاً دخل نہیں تھا کیوں کہ خان غازی کابلی صاحب اور پروفیسر خالد شبیر صاحب دونوں مولانا کے احباب میں سے ہیں۔

بغیر جلد کے کاغذ اور پرنٹنگ ۱۰۰۰ کتاب کا خرچہ ۲۵۰۰/- کا بل بنا ہے۔ حیرت کی بات ہے جس سے میں ششدر رہ گیا۔ وہ یہ کہ جیسی جلد اور کور ہم چاہتے ہیں اس پر ۱۰۰۰ کتاب کا ۵۰۰۰/- روپیہ خرچہ آئے گا۔ یعنی داڑھی سے مونچھیں بڑھ جائیں گی۔

اب سیدھی بات یہ ہے کہ اگر آپ پسند کریں تو سادہ گتے کی جلد پرنٹ ہو جائے اور اوپر عمدہ کاغذ کا کور چڑھا دیں ۵۰۰۰/- روپیہ تمام خرچہ ہوگا۔ جس کا انتظام ہو جائے گا اور کسی کو تکلیف دینے اور کسی کے سامنے ہاتھ پھیلانے کی ضرورت ہی نہیں رہے گی۔ اپنی رائے سے مطلع کریں۔

مولانا حبیب اللہ صاحب اور محسن صاحب کے نام مضامین کے آغاز میں لکھ دیتے ہیں یعنی سرخی سے۔ دوسری سطر میں از جناب ابن امیر شریعت سید عطاء المحسن شاہ بخاری ملتان، دونوں مضامین کے آخر میں سید حانام حبیب اللہ جالندھری اور سید عطاء المحسن شاہ بخاری دار بنی ہاشم ملتان لکھ دیتے ہیں۔

مجھے حافظ امیر سلطان کی چھٹی اور حنیف سہارن پوری کی بیماری نے پریشان کر دیا۔ میری صحت بھی آپ جانتے ہیں۔ اس پر سارا دن ادھر بھاگو ادھر چلو کی پڑی رہتی ہے۔ اس کانفرنس پر کتاب نے نکلنا بھی نہیں۔ زیادہ دور کے لوگ نہیں چنیوٹیوں کا مجمع زیادہ ہوتا ہے۔ یا پھر رات کو فیصل آباد یا پھر سرگودھا سے لوگ عشاء کے بعد پہنچتے ہیں اور ۱۲ بجے رات واپس لوٹ جاتے ہیں۔ البتہ ربوہ کا مجمع عجیب تھا۔ ہزارہ، لوگ، سندھ، بلوچستان، سرحد اور پنجاب کے شہروں سے پہنچے اور تین دن وہاں ڈیرے ڈال کر پڑے رہے۔ دن کا اجتماع ۵۰، ۶۰ ہزار افراد کا ہوتا رہا۔ رات کو تو بلا مبالغہ لاکھ کے قریب کا مجمع ہوتا رہا۔

اس میں پرچے بھی نکلے اور کتابیں بھی۔ اس دفعہ سارا پرچہ امیر شریعت نمبر نکل جانا تھا۔ لیکن حنیف صاحب کی غلطی اور دماغ صاف نہ ہونے کی وجہ سے اگرچہ کم نکلا لیکن پھر بھی توقع سے زیادہ نکل گیا۔

یہ چند باتیں ہیں ان پر اپنی رائے سے مطلع کریں۔ آج مسودات کو دیکھا ہوں تو دن رات

لگ کر کتاب کچھ نہ کچھ کانفرنس تک آسکتی ہے۔ لیکن مسوّدات ہی مکمل نہ ہوں تو میں کیا کروں ؟
گھر میں سب متعلقین کو سلام مسنون عرض کریں۔ والسّلام
دُعاگو تاج محمود غفرلہٗ

---

(۱۶)

عزیزم زاہد منیر خاں صاحب سلمہ اللہ تعالیٰ

السّلام علیکم۔ آپ کے دونوں خطوط مل گئے۔ بٹیا جی!
پہلے بھی کہہ چکا ہوں "تو فکرِ نانِ داری و من فکرِ جانِ زارم"۔ حنیف صاحب نے پریشان کیا ہوا ہے۔ کل رات غالباً بیس روز کے بعد تشریف لائے ہیں۔ صبح اٹھتا ہوں لوگ ناشتہ بھی اطمینان سے نہیں کرنے دیتے۔ صبح ہوتی ہے شام ہوتی ہے اور میں دہلیں کا وہیں رہ جاتا ہوں۔ اب حنیف صاحب کی غیر حاضری میں دو پرچوں کا ناغہ ہوا۔ ایک تو قابل برداشت تھا لیکن دوسرا میرے لئے سخت ذہنی اذیت کا باعث بنا۔ کل پرچہ چھپے گا۔ "حمد" اس شمارہ میں اور آپ کا تبصرہ اگلے شمارہ میں آرہا ہے جمعہ یا ہفتہ کو انہیں گوجرانوالہ بھیجتا ہوں۔ ہمیں کہاں جاکر پھنسا دیا۔ نہ آگے جا سکتے ہیں اور نہ اب جان چھڑا کر کہیں بھاگ سکتے ہیں۔ غلطیاں لگنے کے بعد ایک دفعہ کتاب کا میرا اپنا پڑھنا ضروری ہے۔ پھر جو لغزشیں ہوں گی انہیں یہیں سے ٹھیک کروالیں گے۔ کاتب جان چھوڑے تو اس سے اگلے مرحلے کوئی مشکل نہیں ہیں۔ اصلاح شدہ مسودہ حنیف صاحب کے ہاتھ بھیج دوں گا تاکہ غلطیاں لگا کر دو کاپیاں بھی جوڑ دیں۔ بہتر تو یہ تھا کہ آپ خود گوجرانوالہ دو تین دن کے لئے چلے جاتے اور وہاں قیام کر کے یہ مرحلے طے کر آتے۔ حنیف صاحب آپ کو چھوڑ آتے اور رہائش وغیرہ کا مسئلہ بھی حل کر آتے۔ لیکن خدا جانے آپ کے گھر کے کیا معاملات ہیں ؟
مولانا غازی احمد کی کتاب[1] پر آپ نے تبصرہ بہت خوب لکھا ہے۔ پڑھ کر دل خوش ہوا۔

---

[1] "مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَی النُّوْرِ" جس میں انہوں نے اپنے قبولِ اسلام کی داستان نہایت ایمان افروز

جیتے رہو میری مخلصانہ دعائیں آپ کے لئے وقف ہیں۔
آپ کے خاندان سے سابقہ تعلق بھی نہ تھا اور پھر جمعہ چھوڑنا نہ صرف میرے لیے مشکل تھا بلکہ ہزاروں نیک دل لوگوں کو جو محض میری محبت کی وجہ سے یہاں جمعہ پڑھنے آتے ہیں، مایوس کرنا تھا لیکن اپنے عزیز بیٹے زاہد منیر کی خاطر حاضر ہو گیا اور دل کو تسکین ہوئی کہ ایک مرحوم مرد مومن کی ساری ہی اولاد سعادت مند ہے [1] خصوصاً نیازی صاحب سے مل کر بہت خوشی ہوئی یقین نہیں آتا کہ وہ اس دور کے شخص ہیں۔ شاہد بڑا پیارا بچہ ہے اور شاہد کیا سبھی کے مسکراتے چہرے مجھے بے حد پیارے لگے اور جس عقیدت سے سارا خاندان پیش آیا [2] سوائے مخلصانہ دعاؤں کے میرے پاس اس کا اور کیا بدلہ ہو سکتا ہے۔ میری دعا ہے کہ یہ خاندان دینی اور دنیوی دونوں لحاظ سے سرفراز ہو۔ میری بیٹیوں کو الگ سلام۔ ان کے لئے بے شمار دعائیں۔ جس بیٹی کی شادی ہوئی حق تعالیٰ اسے ہمیشہ ہر لحاظ سے خوش و خرم، سرسبز اور سرخرو رکھے۔ آمین
زاہد بیٹے! میرے خط نہ لکھنے کو محسوس نہ کیا کرو۔ یہ میرے تساہل یا مصروفیتوں کا نتیجہ ہوتا

انداز میں تحریر فرمائی ہے .... مولانا مرحوم کو میری تحریروں میں غازی صاحب کی کتاب پر کیا ہوا میرا تبصرہ بہت پسند تھا اور بار بار وہ اس چیز کا اظہار بھی فرمایا کرتے تھے اور لولاک میں بھی اس تبصرے کی اشاعت کا خصوصی اعلان شائع کرتے کے بعد اس تبصرہ کو لولاک کی اشاعت مورخہ ۲۱ فروری ۱۹۸۲ء میں شائع کیا تھا۔

[1] فروری ۱۹۸۳ء کو راقم الحروف کی بڑی ہمشیرہ کی شادی خانہ آبادی منعقد ہوئی راقم نے مولانا سے اس تقریب میں شمولیت کی درخواست کی تو مولانا نے ازراہ شفقت و محبت میری اس گزارش کو قبول فرما لیا اور باوجود ضعف اور مصروفیات کے مولانا شادی سے ایک دن قبل غریب خانہ پر تشریف لائے اور اگلے روز شام کو نکاح سے فراغت کے بعد واپس لوٹ گئے۔ ہمارے گھر مولانا کی آمد اور قیام میرے لئے بہت بڑا اعزاز تھا جس پر آج بھی مجھے فخر ہے اَللّٰهُمَّ اغْفِرْ لَهٗ

[2] سرگودھا سے واپس جانے کے بعد مولانا اکثر عند الملاقات میرے برادران مکرم جناب شفیق الرحمان فیاضی جناب ساجد منیر چوہدری اور جناب خالد منیر کی بھی تعریف کیا کرتے اور ہم سب کے لئے ہمیشہ دعاگو رہتے تھے۔

ہے نہ کہ بھول جانے کا۔ میری دلی دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ تمہیں ملتِ اسلامیہ کا ایک نیک اور نامی گرامی فرزند بنائے۔ سب کو میری طرف سے مخلصانہ سلام۔

تاج محمود غفرلہٗ

۱۶ر فروری ۱۹۸۳ء

۱۷

عزیزم زاہد منیر سلمہ اللہ تعالیٰ

السلام علیکم۔ اس سے قبل تفصیلی خط تحریر کر چکا ہوں امید ہے مل گیا ہوگا۔ حنیف صاحب کو گوجرانوالہ بھیجا تھا مسودہ بھی غلطیاں لگا ہوا واپس کر دیا ہے اب انہوں نے وعدہ کیا ہے کہ دس مارچ کو کوئی صاحب آجائیں اس وقت تک تمام لکھائی وغیرہ ہم مکمل کریں گے اور غلطیاں بھی لگا دیں گے۔ کاپیاں اپنے سامنے جڑوا لیں۔ آپ نے میرے خط کا جواب نہیں دیا خدا خیر کرے۔ اللہ کرے تمہاری صحت ٹھیک ہو۔

بہت بہت دعائیں۔ گھر میں سب کو سلام مسنون۔ والسلام

دعاگو۔ تاج محمود غفرلہٗ

۱۸

۲۸ر فروری ۸۳ء

عزیز القدر زاہد منیر سلمہ اللہ تعالیٰ

السلام علیکم۔ اس سے پہلے تمہارے خط کے

جواب میں تین خط لکھ چکا ہوں[1]۔ پچھلے خط میں میں نے لکھا ہے کہ جناب حنیف صاحب گوجرانوالہ تشریف لے گئے تھے اور کاپیاں، غلطیاں لگوانے کے لئے بھی دے آئے ہیں۔ کاتب نے بعض دوسری مصروفیات کی وجہ سے ۱۰ مارچ کی تاریخ ڈال دی ہے۔ ۱۰ مارچ بھی کوئی دور نہیں ہے لیکن مجھے شدّت سے اس بات کا احساس ہے کہ غلطیاں لگواتے وقت ہمارا ایک آدمی وہاں ہونا چاہیئے جو کاتب کو توجہ دلاکر غلطیاں لگوالے تاکہ اس کے بعد کے مراحل جلد از جلد طے ہو جائیں۔

سردی کچھ کم ہوئی ہے۔ موسم بدل رہا ہے مجھے بھی کچھ ہوش آیا ہے۔ گڑھ مہاراجہ کی عظمتِ صحابہؓ کانفرنس میں شرکت کا سفر اور پھر سرگودھا آپ لوگوں کے ہاں کا سفر اور دوسری یہاں کی لوکل مصروفیات، جو یقیناً حدِ اعتدال سے بڑھ گئی تھیں، بلائے صحت ثابت ہوئیں۔ ڈاکٹر صاحب نے ای سی جی اور بیڈ ریسٹ کا حکم دے دیا جس کی تعمیل ہوئی۔ اب پھر اٹھا ہوں۔ الحمد للہ طبیعت اچھی ہے۔ خلافِ توقع تمہارا خط نہیں آیا تشویش ہے کہ مبادا صحت خراب ہو۔ نیازی صاحب اور جملہ بہن بھائیوں کو سلام مسنون۔

والسلام۔

تاج محمود غفرلہٗ

---

[1] ان دنوں میں بعض اسفار اور مصروفیات میں ایسا مبتلا ہوا کہ مولانا کے خطوں کے جواب بھی نہ دے سکا۔ پھر جب یہ خط ملا تو میں نے خط لکھنے کی بجائے فوراً مولانا کی خدمت میں حاضر ہو کر اپنے اس تساہل کی معذرت کی۔

۱۹

عزیزم زاہد منیر صاحب سلمہ اللہ تعالیٰ

السلام علیکم۔ مزاج شریف۔ آپ کے دونوں خط ملے۔ طبیعت کی ناسازی اور اسلم قریشی[1] کی پریشانی اور مصروفیات کی وجہ سے جواب نہیں دے سکا۔ کتاب کے سلسلے میں جلد کا آرڈر لاہور میں دے آیا ہوں۔ یہ تینوں جلدیں، ہلکا عنابی، ایک ہلکا سبز اور ایک ہلکا زرد - جلد ساز نے بطور نمونہ بھیجے ہیں۔ مجھے تو یہ سبز رنگ پیارا لگ رہا ہے۔

---

[1] ۱۷ فروری ۱۹۸۳ء کو مجلس تحفظ ختم نبوت کے مبلغ مولانا محمد اسلم قریشی ختم نبوت کے ایک جلسہ کے سلسلہ میں سیالکوٹ سے موضع سمبڑیال جا رہے تھے کہ راستے میں اغوا کر لیے گئے۔ اس واقعہ کی ایف۔ آئی۔ آر تھانہ سیالکوٹ میں درج کرائی گئی۔ اس میں اس خدشہ کا اظہار کیا گیا کہ ان کے اغوا میں مخصوص پس منظر کے تحت قادیانی جماعت کا ہاتھ ہے۔ اور بعد ازاں حالات و واقعات نے اس خدشہ کی تصدیق بھی کر دی۔ ابتداءً یہ کیس سیالکوٹ کی مقامی پولیس کے پاس رہا لیکن، جب اس مسئلہ کی سنگینی کے پیش نظر مجلس عمل تحفظ ختم نبوت کا قیام عمل میں آیا تو اس مجلس نے پولیس کی غیر تسلی بخش کارکردگی کی بنا پر کیس کو کرائمز برانچ کے سپرد کرنے کا مطالبہ کیا جو منظور کر دیا گیا۔ مگر کرائمز برانچ نے بھی اس سلسلہ میں کسی خاص کارکردگی کا مظاہرہ نہیں کیا تو بعدہٗ ایک سپیشل تحقیقاتی ٹیم کا قیام عمل میں لایا گیا۔ مگر تفتیش آگے نہ بڑھ پائی۔ نتیجۃً اس مسئلہ پر ملک بھر میں اضطراب بڑھ گیا اور اپریل ۱۹۸۴ء میں مجلس عمل کی جانب سے ایک تحریک چلانے کا اعلان کر دیا گیا۔ تحریک کی اعلان کردہ تاریخ سے ایک روز قبل صدر پاکستان نے مجلس عمل کے بعض مطالبات کو تسلیم کرتے ہوئے قادیانیوں کے لیے اسلامی اصطلاحات کے استعمال پر پابندی عاید کرتے ہوئے امتناعِ قادیانیت آرڈی ننس جاری کر دیا اور ساتھ ہی مولانا اسلم قریشی کی تلاش کے کام کو تیز کرنے کا اعلان بھی کیا۔ مگر صدر صاحب کے اس اعلان کے باوجود تفتیش ابتدائی خطوط سے ایک انچ آگے نہ بڑھی اور معاملہ جوں کا توں رہا۔ حتیٰ کہ تادمِ تحریر تفتیش کا دائرہ کار وہی ہے جو ۱۹۸۳ء میں تھا اور تحقیقاتی ٹیموں کی کارکردگی بھی مجلس عمل کے راہنماؤں کی نظر میں صفر رہی ہے جس کا واضح ثبوت، مولانا قریشی کا اب تک کوئی سراغ نہ ملنا ہے۔

دو تین دن تک ہماری اصل کتاب کے نمونے بھی لاہور سے آجائیں گے۔ اگر آکر ایک نظر دیکھ لو اور اپنے انتخاب کا فیصلہ بھی کر جاؤ تو بہتر ہو گا۔ بدقسمتی یہ ہے کہ اس سال سکول میں نصاب تبدیل ہو گیا۔ نئے نصاب کی کتابیں دھڑا دھڑ چھپ رہی ہیں۔ تمام پریس تنگ ہیں۔ اسلم بھی درحقیقت مصروف تھا لیکن اس نے اس وقت ظاہر نہیں کیا۔ اسی وجہ سے وہ ایک یا ڈیڑھ ماہ کی مہلت مانگتا تھا۔ روپیہ چار ہزار مجھ سے لے گیا اور مزے سے اپنے کاروبار میں استعمال کر لیا۔

خیر دیر آید درست آید۔ کتاب اگرچہ کچھ تاخیر سے آئے گی لیکن انشاء اللہ کتاب ضرور آئے گی اور بہترین آئے گی۔ والسلام۔

دعاگو۔ تاج محمود غفرلہ

۲۰

عزیزم زاہد منیر صاحب سلمہ اللہ تعالیٰ

السلام علیکم۔ آپ کا رقعہ ملا۔ جمعہ کے دن میں سیالکوٹ گیا ہوا تھا۔ اسلم قریشی کا قصہ ہماری زندگیوں کا دردناک سانحہ بن گیا ہے۔ افسوس یہ افتاد ہم پر اس وقت پڑی جب جوانی، صحت اور ساتھی سب رخصت ہو چکے ہیں۔ اکیلا کس کس پہاڑ سے ٹکراؤں؟

اسلم قریشی کا مقدمہ اب وہاں کی مقامی پولیس سے لے لیا گیا ہے اور کرائمز برانچ کے سپرد کر دیا گیا ہے راجہ سرفراز صاحب ایس۔ پی اور خان مشتاق احمد خان صاحب۔ ڈی۔ ایس۔ پی مقرر ہوئے ہیں۔ ان سے ملنے کے لئے گیا تھا۔

اس دفعہ مولانا نعیم آسی کے ہاں "تا جماعت" گیا ان سے ملا۔ اطمینان ہوا کہ سمجھدار اور لکھا پڑھا نوجوان ہے۔ کسی مسجد میں نمازِ جمعہ بھی پڑھاتے ہیں۔ اپنی دو کتابیں بھی مجھے دیں۔ آپ کی طرح لکھنے

پڑھنے کا شوق رکھتا ہے۔

میرے خط کا آپ کو انتظار کرنا پڑا اور ساتھ ہی طرح طرح کی بے حقیقت قیاس آرائیاں بھی۔ فون آپ کے دونوں مل گئے تھے۔ آپ میرے ساتھ نہ آسکے[1] لیکن بہتر ہوا ایک بجے رات ملتان پہنچا اگلے روز مجھے تقریباً پورا دن شوریٰ کے اجلاس میں بیٹھنا پڑا اسی شام بذریعہ کار بہاول پور پہنچے وہاں رات کو جلسہ تھا جو ایک بجے (رات) ختم ہوا۔ دو بجے رات میزبان کے ہاں کھانا نصیب ہوا اور پھر اسی وقت ملتان روانہ ہوئے۔ صبح چار بجے ملتان آوارد ہوئے۔ اگلا دن دفتر کے کاموں اور متفرق مشوروں میں گزر گیا۔ شام پانچ بجے فیصل آباد کے دوست جو اپنے کام سے ملتان گئے ہوئے تھے ان کے ہمراہ بذریعہ کار واپسی ہوئی رات ساڑھے نو بجے گھر پہنچے۔

کتاب کی اشاعت میں طویل تاخیر کا آپ کو فکر اور دکھ لاحق ہے۔ میں آپ کے جذبات سے آگاہ ہوں لیکن مجھے اب آپ سے بھی زیادہ پریشانی ہے۔ اسلم (پریس والا) بڑا چالاک آدمی ہے۔ مجھ سے باتیں بنا کر اور سبز باغ دکھا کر چار ہزار روپے لے لئے اور اب کہتا ہے کہ جلد انار کلی کا کوئی دفتری تیار

---

[1] اس سے پہلے بھی جب مولانا ایک بار سیالکوٹ ہو کر آئے تو میں نے مولانا سے دریافت کیا کہ آپ کی نعیم آسی صاحب سے ملاقات ہوئی؟ اس پر مولانا نے نفی میں جواب دیا تو میں نے آسی صاحب سے اپنے تعلق خاطر کی بنا پر عرض کی کہ آئندہ جب آپ جائیں تو ان سے ملاقات کا پروگرام مدنظر رکھیں۔ چنانچہ اگلی بار جب مولانا کی ان سے ملاقات ہوئی تو مولانا نے مجھے یہ لکھا۔

[2] ۲۳ اپریل ۸۳ء کو سرگودھا میں ایک ختم نبوت کانفرنس منعقد ہوئی مولانا اس میں شرکت کے لئے سرگودھا آئے تو پہلے احقر کے غریب خانہ پر تشریف لائے اور پھر کانفرنس میں شرکت فرمائی۔ کانفرنس کے بعد مولانا نے بتایا کہ چند دن تک ایک جلسہ میں شرکت کے لئے بہاول پور جانا ہے۔ اور مولانا چاہتے تھے کہ میں بھی اس موقع پر ان کے ساتھ چلوں۔ اس وقت تو میں نے حامی بھر لی مگر جب مولانا گاڑی میں میری سیٹ وغیرہ بک کروا چکے تو مجھے کوئی مجبوری آن پڑی اور میں فیصل آباد نہ جا سکا۔ (بہاول پور جانے کے لئے مولانا کے ساتھ فیصل آباد سے روانگی کا پروگرام طے ہوا تھا) اور مولانا غالباً اکیلے ہی بہاول پور کے لئے روانہ ہوئے۔ اس سفر سے واپسی پر جس میں انہوں نے مجلس تحفظ ختم نبوت کی شوریٰ کے اجلاس منعقدہ ملتان میں بھی شرکت کی، مولانا نے مجھے یہ خط لکھا۔

کر رہا ہے۔ نمونہ اگرچہ تیار ہو کر آگیا ہے مگر وہ بدقسمتی سے پسند نہیں آیا سیاہی مائل گاڑھے رنگ کا ریکسین ہے جب میں نے اس کا گلہ کیا تو اس نے انکشاف کیا کہ پہلے جو نمونے آپ کو کسی دوسری کتاب کے دکھائے تھے ان پر ریکسین نما کاغذ لگا ہوا ہے چنانچہ میں نے ان گتوں کو کریدا تو وہ واقعی کاغذ تھا۔ اس کا کہنا ہے کہ ہمارے دفتری نے بہترین ریکسین لگایا ہے اور یہ جلد بہت مضبوط ہوگی جب کہ میرا انکار اس کے سیاہی مائل اور دھبے دار رنگ کی وجہ سے ہے۔ میں نے اسے کہا ہے کہ یہ جلد ہمیں منظور نہیں۔ براہ کرم ریکسین مضبوط ہو لیکن اس کا رنگ ہلکا ہو اور ایک جیسا ہو۔

عزیزم! پھنس گیا ہوں۔ اسے میری سادگی سمجھ لیجئے لیکن میں چھوڑوں گا تو نہیں۔ کام ضرور ہوگا۔ انشاء اللہ۔

اصل میں اس نے پیسے اپنے کاروبار میں لگا لئے اور اب آئیں بائیں شائیں کر رہا ہے اس میں میرا کوئی قصور یا نیت کی خرابی نہیں۔ کتاب آئے گی اور ضرور آئے گی اور اب انشاء اللہ جلد آئے گی۔ یہ علیحدہ بات ہے کہ ہماری پسند میں انیس بیس کا فرق ہو جائے۔

مجھے نہیں معلوم کہ تمہارا خط کون لایا۔ گھر سے بچوں نے خط دیا تو میں نے یہ چند سطریں لکھ دی تھیں تاکہ سند رہیں۔

اطمینان ہوا کہ تم اچھے ہو۔ میری صحت بھی اللہ کا شکر ہے کہ بہتر جا رہی ہے۔ خط میں تاخیر سے رنجیدہ نہ ہوا کرو۔

دعا گو۔ تاج محمود غفرلہٗ [۲]

---

[۱] اس خط سے کچھ دن پیشتر راقم بکرم شفیق الرحمٰن فیاضی صاحب فیصل آباد جا رہے تھے تو میں نے انہیں مولانا کو پہنچانے کے لئے ایک رقعہ دے دیا تھا۔ جب وہ رقعہ لے کر مولانا کے دولت کدہ پر حاضر ہوئے تو مولانا اس دن غالباً سیالکوٹ گئے ہوئے تھے واپسی پر انہوں نے میرا رقعہ پڑھا اور یہ خط تحریر کیا۔

[۲] اس خط پر تاریخ درج نہیں ہے مگر میرا اندازہ ہے کہ یہ خط اپریل ۸۳ء کے اواخر میں لکھا گیا۔ کیونکہ مولانا کو سرگودھا اور بہاول پور کے اسفار اپریل ہی میں پیش آئے تھے۔

(۲۱)

عزیزم زاہد منیر سلمہٗ ربکم

السلام علیکم۔ دو ریکسین اور چار پولی یقین کپڑا جو کہ نہایت مضبوط چیز ہیں، کے نمونے بھیج رہا ہوں۔ ریکسین چھوٹی کترنیں براؤن ہلکا اور براؤن ڈارک ہیں۔ اب کون سا لگایا جائے؟ یہ فیصلہ کرنا ہے۔ کتاب چھپنا شروع ہو گئی ہے۔ سات کاپیاں آج چھپ گئی ہیں بہتر ہے کہ تم خود موقع پر آؤ اور جلد کا فیصلہ کر جاؤ۔ اگلے ہفتے میں غائب ہوں گا۔ تکلیف کر کے آجاؤ اور فیصلہ کر جاؤ۔ والسلام۔

تاج محمود غفرلہٗ

---

(۲۲)

۹ رمئی ۸۳ء

عزیزم زاہد منیر صاحب سلمہٗ اللہ تعالیٰ

السلام علیکم۔ امید ہے صحت بخیر ہو گی۔ میرا پرسوں کا بھیجا ہوا خط مل گیا ہوگا۔ اسلم سے خود جا کر ملا ہوں اور اسے کہا کہ کاپیاں واپس دے، چار ہزار روپیہ جائے بھاڑ میں۔ اس نے حسبِ عادت معذرت کی اور میری افتادِ طبع کو جانتے ہوئے گزشتہ را صلوٰۃ اور آئندہ را احتیاط کا وعدہ کر لیا۔

کتاب کی پرنٹنگ آج شروع ہو جائے گی۔ تین دن میں طباعت مکمل ہو جائے گی۔ اس کے بعد فولڈنگ اور کتاب کی ترتیب و سلائی وغیرہ کا مسئلہ ہوگا۔ لیکن اصل مسئلہ جلد کا ہے جو آپ کی طبعِ رسا اور جولانیٔ ذوق کی بدولت کھٹائی میں پڑا ہوا ہے۔ اگر ہم سادہ جلد کرتے یا کور والی رکھتے تو وہ سستی بھی پڑتی اور آج تک کتاب قارئین تک پہنچ بھی چکی ہوتی۔

اب یہاں کے ایک دفتری نے ریکسین کا یہ نمونہ بھیج دیا ہے۔ جو خط کے ہمراہ اسی لفافہ میں

ارسال ہے ۔ کل دو اور نمونے بھی بھیجوں گا تاکہ ایک تو متفرق نمونے آپ کے سامنے ہوں اور دوسرا میرے خطوں کا کوٹہ بھی پورا ہو جائے جس کا تمہیں بہت گلہ ہے[1]۔

جو نمونہ پسند آئے لے لو باقی واپسی ڈاک بھیج دیں ۔ جو ناپسند ہوں ان کے بھیجنے کی ضرورت نہیں ہے مصیبت یہ ہے کہ پسند آپ کی منظور ہوگی اور آپ موقع پر موجود نہیں اور دُور از کار توہمات میں مبتلا رہنے لگے ہیں[2]۔

جب گزشتہ روز سیالکوٹ گیا تھا تو نعیم آسی نے دو کتابیں "مکاتیب امیر شریعت" اور "اقبال اور قادیانی" دی تھیں میں نے حسبِ عادت انہیں جستہ جستہ مقامات سے دیکھا ہے اچھی اور کامیاب کوشش ہے۔

خدا کرے جناب والا کی کوشش اور محنت بھی میدان میں آ جائے ۔

برادران و عزیزان کی خدمت میں سلام مسنون عرض ہے ۔

دعاگو ۔ تاج محمود غفرلہٗ

مکرر آنکہ ۱۴ مئی سے ۱۹ مئی تک فیصل آباد میں نہیں ہوگا راولپنڈی اور ہری پور جانے کا خیال ہے ۔ والسلام ۔

دعاگو ۔ تاج محمود غفرلہٗ

---

[1] ان دنوں مولانا بعض مصروفیات کی بنا پر میرے کچھ خطوں کا جواب نہیں دے سکے تھے جس کا میں نے مولانا سے شکوہ کیا یہ میرے اس شکوہ کا جواب ہے ۔

[2] یہ محض مولانا کا گمان تھا ورنہ ساری صورت میرے سامنے تھی اور مجھے مولانا سے اس مسئلہ میں کوئی گلہ نہیں تھا ۔

[2] یہ اور اس سے پہلا (مکتوب نمبر ۲۱) خط مجھے ایک ہی دن موصول ہوئے تھے اور میں اسی روز فیصل آباد روانہ ہو گیا تھا ۔

(۲۳)

عزیزم زاہد منیر صاحب۔

السلام علیکم ورحمۃ اللہ۔ اپنے مخلصوں اور دعاگوؤں کے متعلق یوں دل میں خیالات نہ آنے چاہئیں[1]۔ امید ہے صحت بخیر ہوگی۔ گھر میں عافیت ہوگی۔ نیازی صاحب[2] کے بعد آپ لوگوں کے لئے نئی طرح کی زندگی ہے۔

کتاب کی طباعت میں غیر معمولی تاخیر افسوس ناک بلکہ المناک ہے لیکن اس میں میری سادگی قصور وار ہوگی، دل قصور وار نہیں اس لئے لکھ رہا ہوں کہ بدگمانی سے بچو۔

اِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ اِثْمٌ

ایسی بدگمانی بری بات ہے

یہاں پر خیریت ہے۔ مولانا اسلم قریشیؒ کے سلسلہ میں پریشانی ہے۔ حکومت۔ اوّل تو کچھ کر ہی نہیں رہی اور اگر دکھاوے کے لئے کچھ کر رہی ہے تو اس میں سرد مہری شامل ہے۔

کتاب وعدہ کے مطابق یکم جون تک آ جانے کی[3]۔ انشاء اللہ۔ عزیزان کو سلام اخلاص۔ گھر میں

---

[1] یہ بھی مولانا کا محض گمان تھا بات صرف اتنی تھی کہ میں نے پریس والے کے رویئے سے تنگ آ کر یا مولانا کی طرف سے اپنے کسی خط کا جواب نہ ملنے پر کوئی شکوہ آمیز فقرہ لکھ دیا تھا۔

[2] ۱۱ مئی ۸۳ء کو احقر کے برادر بزرگ جناب حبیب الرحمن نیازی صاحب اپنی ملازمت کے سلسلہ میں سرگودھا سے مستقل رہائش کے لئے کراچی منتقل ہوئے۔ چونکہ ۱۹۷۰ء میں والد صاحب کی وفات کے بعد بھائی صاحب نے حتیّ الوسع ہمیں والد صاحب کی کمی کا احساس نہ ہونے دیا تھا اس لئے ان کے کراچی چلے جانے کے بعد فی الواقع ہمارے لئے ایک نئی طرح کی زندگی کا آغاز ہوا تھا۔

[3] پریس والے نے نہ معلوم ہمیں کتنی تاریخیں دیں اور لطف کی بات یہ کہ ان میں سے ایک تاریخ پر بھی اس نے کتاب تیار کر کے نہ دی یہ غالباً آخری تاریخ تھی جو اس نے ہمیں دی مگر اس تاریخ پر بھی اس نے ساری کتاب تیار نہ کی صرف ایک نسخہ تیار کر کے ہمارے ہاتھ میں تھما دیا۔

سب کو دعائیں ۔ والسلام ۔

تاج محمود غفرلہٗ

فیصل آباد ۲۴؍مئی ۸۳ء

---

(۲۴)

عزیزم زاہد منیر سلمہٗ اللہ تعالیٰ

السلام علیکم ۔ مزاج شریف ۔ آپ کا خط مل گیا ۔ بڑی حیرانی کی بات ہے کہ آپ کو پرچہ نہیں ملتا ۔ حالانکہ بنڈل اور علیحدہ پرچہ ہر ہفتے یہاں سے پوسٹ ہوتا ہے کوئی راستہ میں گڑبڑ کرتا ہے کوئی بے ایمان قادیانی ہوگا[1]

آج تازہ شمارہ اور پچھلا شمارہ میں پھر بھیج رہا ہوں اور ساتھ ہی درخواست بھی بھجوا رہا ہوں کہ[2] منسلکہ

---

[1] احقر کو ہفت روزہ لولاک اور اپنی دیگر ڈاک کی وصولی میں اکثر اس وقت کا سامنا رہتا ہے کہ مجھے ڈاک یا تو بروقت نہیں ملتی یا پھر ملتی ہی نہیں اس کی وجہ نہ معلوم کیا ہے؟ اپنی اس پریشانی کا ذکر میں نے مولانا کے نام اپنے خطوں میں بھی کئی بار کیا جس پر مولانا نے مجھے یہ جواب دیا ۔

[2] اتفاق سے مولانا کی وفات حسرت آیات کے بعد ان کے بعض کاغذوں میں سے یہ درخواست بھی برآمد ہوگئی جسے میں نے بطور یادگار محفوظ کر لیا ۔ ذیل میں تبرکاً "از نوادر" کے طور پر اس درخواست کو یہاں نقل کرتا ہوں ۔

بخدمت انچارج ڈاک خانہ ریلوے میل سروس فیصل آباد

جناب عالی! درخواست ہذا کے ساتھ بنڈل لولاک ہر ہفتے اس پتہ "زاہد منیر عامر منیر منزل ۹۲۔ اسلام پورہ گوجرانوالہ" پر باقاعدگی سے بھیجا جاتا ہے ۔ لیکن مکتوب الیہ کی طرف سے برابر شکایت موصول ہو رہی ہے کہ اسے پرچہ نہیں مل رہا براہ کرم رکاوٹ کا انسداد فرمائیں تاکہ مکتوب الیہ کو پرچہ ہفت روزہ لولاک ہر ہفتے مل جایا کرے ۔

عرضے

تاج محمود غفرلہٗ ۔ ایڈیٹر ہفت روزہ لولاک

پتہ پر پرچہ نہیں ملتا۔

کتاب اکاؤکا نکل رہی ہے۔ غالباً ۲۶، ۲۷ اکتوبر کو ربوہ میں کانفرنس کا فیصلہ کر رہے ہیں۔
اِس پر اللہ کو منظور ہوا تو کافی نکل جائے گی۔

برادران و متعلقین کو سلام مسنون۔ والسلام

دعاگو۔ تاج محمود غفرلہ

۱۵-۹-۸۴ / ۱۵ ستمبر ۸۴ء

---

(۲۵)

عزیزم زاہد منیر سلمہ اللہ تعالیٰ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔ آپ کے دونوں خط مل گئے۔ آخری خط کے ہمراہ تبصرہ۔ نظم اور مضمون تینوں چیزیں موصول ہو گئی ہیں۔ آپ کی مصروفیت سے مجبوری ہے ورنہ اب آپ لولاک کے ادارہ تحریر میں شامل ہیں۔

مَیں خیریت سے ہوں۔ خطوں کا بستہ جہاں رکھ گئے تھے وہیں پڑا ہے اور پڑا رہے گا جب کبھی پھر آؤ گے تو آگے دیکھیں گے۔ ۱۱ دسمبر کو لاہور میں کنونشن ہو رہا ہے۔ گیارہ تاریخ صبح نماز پڑھتے

لہ مولانا تاج محمود کے پاس بہت سی نامور شخصیات کے خطوط کا ایک ذخیرہ موجود تھا۔ مَیں اس بارے میں مولانا سے گزارش کیا کرتا تھا کہ وہ کسی وقت ان خطوط کو مرتب کر کے شائع کر دیں۔ مولانا اپنی دوسری مصروفیات کی وجہ سے اس مسئلہ میں میری تائید کرنے سے آگے نہ بڑھ سکے تو بالآخر میں نے خود ہی اس کام کا بیڑا اٹھایا اور مولانا سے وہ ذخیرہ نکلوا کر ان کی ترتیب کا کام شروع کر دیا۔ اب چونکہ ان خطوں کے مخاطب خود مولانا تھے اس لئے مَیں ان سے ہر خط کا پس منظر دریافت کرتا اور اسے اپنے لفظوں میں تحریر کر لیتا تھا۔ فیصل آباد میں میرا قیام چونکہ دو ایک روز سے زیادہ نہ ہوتا تھا اس لئے دو دن میں جتنے خطوں کا پس منظر لکھا جاتا مَیں اسی پر اکتفا کر کے واپس آ جاتا تھا اور باقی کو آئندہ دورۂ فیصل آباد تک اٹھا رکھتا تھا مگر

ہی ہم لاہور کے لئے روانہ ہو جائیں۔ رات کو اگر آ گئے تو تمہیں بھی ساتھ لے جائیں گے۔ امید ہے آپ کے گھر والے اور برادران کرام سب خیریت سے ہوں گے۔ والسلام

دعاگو۔ تاج محمود غفرلہ

۲۶

عزیزم زاہد منیر صاحب زید مجدکم

السلام علیکم۔ مزاج شریف؟ آپ کے خط ملے خیریت معلوم ہوئی۔ کتاب لولاک کا جاری ہے۔ ۲۷، ۲۸ اکتوبر جمعرات، جمعہ کو ربوہ میں کانفرنس ہو رہی ہے کوشش ہوگی کہ اس موقعہ پر بھی کچھ کتاب نکل جائے۔ ان ڈیڑھ سو کتاب پہلے جا چکی ہے۔ سو مزید مانگی گئی ہے اب انہیں جلسہ کے بعد ہی دیں گے۔ عموماً دس روپے والی کتاب ہی جاتی ہے

مارچ میں بیسویں سالگرہ نمبر[1] کے لئے معاملہ ابھی تک سوچ و فکر ہی تک محدود ہے۔ غضب یہ ہوا کہ کاغذ ختم ہو گیا ہے۔ اب کراچی سے منگوانے کا بندوبست ہوگا تو سکون ہوگا ورنہ کاغذ کی فراہمی اخباری دنیا میں بڑا دردِ سر ہے۔

وائے افسوس کہ ابھی نصف خطوط کے پس منظر ہی لکھے گئے تھے کہ ۲۰ جنوری ۸۴ء کو مولانا اس جہان سے عالم باقی کی طرف کوچ فرما گئے اور یہ سلسلہ جہاں ۲۹ دسمبر ۸۴ء کو (جس دن میری مولانا سے آخری ملاقات تھی) تھا۔ وہیں کا وہیں رہ گیا اور مولانا کی وفات کے بعد اب تک بعض دوسری مصروفیات کی وجہ سے میں بھی اس طرف توجہ نہیں دے سکا۔ اور یہ کیسی عجیب بات ہے کہ مولانا کے نام دوسروں کے خطوط چھپتے چھپتے خود مولانا کے خطوط چھپنے کا وقت آ گیا۔

[1] مارچ ۸۴ء میں ہفت روزہ لولاک کو جاری ہوئے بیس برس مکمل ہو رہے تھے تو احقر نے مولانا کو اس موقع پر لولاک کا بیس سالہ نمبر شائع کرنے کی تجویز پیش کی جب میں نے مولانا کو دستاویز دے دی تو پایا تو اس

دعاگو ہوں۔ خط نہ لکھنے کی وجہ آپ کو معلوم ہی ہے۔ یہ نہیں کہ آپ یاد نہیں۔ نہیں، آپ کی یاد سے غفلت کبھی نہیں کی۔ برادران کو سلام مسنون۔ اللہ کرے گھر میں خیریت ہو اور سب سے بڑھ کر دعا کرتا رہتا ہوں کہ نیازی صاحب کو استقلال اور سکون نصیب ہو۔ والسلام

دعاگو۔ تاج محمود عفرلہٗ

---

(۲۷)

عزیزم زاہد منیر سلمہ اللہ تعالیٰ

السلام علیکم۔ مزاج بخیر۔ آپ کا خطاب عشا کے بعد بستر میں پڑھا ہے اور ابھی جواب تحریر کر رہا ہوں [1]۔

منیر کے کچھ نقشے بنانے شروع کر دیئے تھے لیکن ابھی یہ نقشے فکر و خیال تک ہی محدود تھے کہ مولانا کا سانحۂ ارتحال پیش آگیا اور نوائے کے بیس سال پورے ہونے سے پہلے مولانا کے لمحاتِ حیات پایۂ تکمیل کو پہنچ گئے۔

إِنَّا لِلّٰهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ

اور مولانا کی وفات کے بعد چونکہ ہم نے "مولانا تاج محمود نمبر" کے کام کا آغاز کر دیا اس لئے یہ نمبر خود بخود رفت و گذشت ہو گیا۔

[1] یہ مولانا تاج محمود مرحوم کا آخری خط ہے جو مجھے ان کی وفات سے صرف دو دن پہلے یعنی ۱۸ جنوری ۸۴ء کو موصول ہوا۔ مولانا کے نواسے برادرم شفیق احمد ایم اے کے بیان کے مطابق مولانا ۱۶ جنوری کی شام کو کسی سفر سے واپس لوٹے تو سونے سے پیشتر انہوں نے اپنی غیر موجودگی میں آنے والی ڈاک منگوا کر دیکھی اور میرا خط دیکھ کر شفیق صاحب کو اس کا جواب لکھوانے لگے لیکن پھر کچھ خیال آیا اور سفر کی تکان کے باوجود کہنے لگے کہ اچھا میں خود ہی اس کا جواب لکھوں گا۔ یہ کہہ کر میرے خط کا محولہ بالا جواب تحریر فرمایا اور سو گئے۔ اگلے روز صبح کو یعنی ۱۷ جنوری کو یہ خط پوسٹ کرایا گیا (جیسا کہ اس کے لفافہ پر فیصل آباد ڈاک خانہ کی مہر ظاہر کرتی ہے) اور ۱۸ جنوری کو مجھے یہ خط موصول ہو گیا۔ یہ خط نہ صرف میرے نام مولانا کا آخری خط ہے بلکہ یہ ان کی زندگی کا بھی آخری خط ہے کیونکہ اس کے بعد مولانا نے اور کوئی خط نہ لکھا۔

جو چیزیں آپ کی طرف سے اشاعت کے لئے آتی ہیں وہ اسی وقت حنیف صاحب کو دے دی جاتی ہیں۔ ابھی انہوں نے آپ کی بھیجی ہوئی مولانا ظفر علی خاںؒ کی کتابت شدہ نظم دکھائی۔ کئی الفاظ نہ ایڈیٹر کی سمجھ میں آرہے تھے اور کاتب نے جگہ بھی خالی چھوڑی ہوئی تھی۔ مولانا کے قافیوں اور عربی الفاظ سے عصرِ نو بالکل نامانوس ہے میں نے وہ پڑھ کر ان کے ذہن نشین کئے ہیں۔

مولانا غازی احمد کا سلام ملا۔ وہ بڑی مہربانی فرماتے ہیں لیکن ان کی کتاب کے جدید ایڈیشن پر تبصرہ ابھی ہمارے ذمہ باقی ہے[1]

لاہور میں غالباً ۱۲ر جنوری کو چوہدری افضل حق کی لڑکی نے اپنی بیٹی کی شادی کی ہے۔ ان کے خاوند کا نام خالد صاحب ہے۔ فیصل آباد سے بارات گئی ہوئی تھی۔ ہلٹن ہوٹل میں اسکا انتظام کیا گیا تھا۔ میرے ایک دوست اس شادی میں شریک تھے۔

"علماء کنونشن" اور صدر صاحب سے ملاقات کی روداد لولاک کی حالیہ اشاعت میں چھاپ دی گئی ہے امید ہے دیکھ لی ہوگی[2]

۱۱، ۱۲ جنوری کو لاہور میں صوبائی سیرت کانفرنس تھی اس میں بھی مدعو تھا "حضور معلم اوّل و آخر" کے موضوع پر مقالہ پڑھا۔

---

[1] ان دنوں محترم غازی صاحب کی آپ بیتی مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَی النُّوْرِ کا نیا اضافہ شدہ ایڈیشن شائع ہوا تھا اور غازی صاحب نے اس کی ایک ایک کاپی حضرت مولانا مرحوم اور احقر کو بھی ارسال فرمائی تھی اور ساتھ ہی لولاک میں اس پر تبصرہ تحریر کرنے کے بارے میں فرمایا تھا۔ مولانا مرحوم کو اس تبصرے کا بہت فکر تھا اور انہوں نے مجھے تبصرہ لکھنے کے لئے ایک سے زائد مرتبہ کہا مگر میں اُن دنوں مختلف النوع مصروفیات میں ایسا گھرا ہوا تھا کہ باوجود خواہش کے تبصرہ لکھنے کے لئے وقت نہ نکال سکا۔ اسی دوران مولانا کا انتقال ہوگیا اور پھر کئی دن اس صدمہ سے سنبھلتے سنبھلتے گزر گئے۔ یہاں تک کہ یہ تبصرہ میں نے ۲۱ر فروری ۸۴ء کو لکھا اور یہ ۱۶ر مارچ ۸۴ء کے لولاک میں شائع ہوا

[2] ۴، ۵ر جنوری ۸۴ء کو وزارت مذہبی امور کی طرف سے اسلام آباد میں دو روزہ کل پاکستان علماء کنونشن منعقد کیا گیا تھا جس میں مولانا مرحوم بھی مدعو تھے چونکہ مجھے مولانا کی اس کنونشن میں شرکت کا علم تھا اس لئے میں نے اپنے خط میں

۱۵ تاریخ کو مجلس عمل کے اجلاس میں بھی شرکت ہوئی دہاں مجھ سے سوال ہوا کہ آپ صدر سے ملاقات کی روئداد سنائیں .... بہرحال اُدھر بھی ہو آئے ہیں اور اِدھر بھی۔ معلوم نہیں کس کا شعر ہے ؎

معشوقِ ما بشیوۂ ہر کس برابر است
با ما شراب خورد و بہ زاہد نماز کرد

گورنمنٹ کے ٹوڈیوں کی مجلس میں بھی شریک ہو آئے ہیں اور باغیوں سے بھی مجلس ہو گئی ہے۔ ایک میراثی کی ماں مر گئی تھی۔ ایک بیٹا دوسری صبح اس کے سرہانے بیٹھا قرآن پڑھ رہا تھا اور دوسرا پائنتی ڈھولک بجا رہا تھا۔ کسی نے کہا "کیا ستم ظریفی ہے یہ دو متضاد باتیں؟" تو انہوں نے کہا "اماں کا کچھ معلوم نہیں، قرآن پر خوش ہوتی ہے یا ڈھولک پر"

تمہارا دل فیصل آباد آنے کو چاہتا ہے۔ آخر بلاوجہ تو نہیں۔

سب کو السلام علیکم۔ والسلام۔

تاج محمود غفرلہٗ

مولانا کو لکھا کہ آپ اس کنونشن کی روئداد اور وہاں پر ہونے والی ملاقاتوں کی تفصیل لولاک میں لکھیں جس کے جواب میں مولانا نے یہ تحریر فرمایا۔ مولانا نے صدرِ مملکت جنرل ضیاء الحق سے قادیانیت کے مسئلہ پر اپنی اس اہم ملاقات کی جو روئداد قلمبند کی تھی وہ لولاک کی اشاعت مورخہ ۱۱ جنوری ۱۹۸۴ء میں شائع ہوئی تھی۔

ضمیمہ

جیل سے لکھے ہوئے ایک خط کا عکس

۲

FORM B

(See Rule 24 of the Punjab Communal Detenue Rules, 1946)

Full name of sender .... تاج محمود

Full name, address and relationship of addressee and of any other person mentioned in the letter .... بھائی مولوی محمد صادق

۲۰ — میڈیکل ہال .... کاٹن ملز .... چنیوٹ گھر .... لائل پور

To be detached here .... نظر بند

کیمبل پور ڈسٹرکٹ جیل .... Jail

برادرم مولوی محمد صادق صاحب السلام علیکم [illegible] 21 تاریخ میں نے 15 اپریل
کو لاہور سنٹرل جیل سے ایک خط آپ کے نام تحریر کیا تھا۔ ۲۲ اپریل کو مجھے کیمبل پور جیل میں
لایا گیا ہے۔ ملاقات بڑی مشکل ہے لہٰذا ملاقات کے لئے کوئی نہ آئے البتہ خط تحریر کر کے
گھر کے حالات والدہ صاحبہ کی صحت [illegible] کے حالات تحریر کریں [illegible]
کی ضرورت نہیں [illegible] لفافے کے ذریعہ میرا خط [illegible] والد صاحب کو بھیج دیا کریں۔ کیمبل پور
سے ۲۲ اپریل کو میں نے والد صاحب کو خط لکھا تھا [illegible]
مجھے [illegible] بچوں کی خیریت کی اطلاع دیتے رہیں والدہ صاحبہ کو میں [illegible]
[illegible]
مجھے [illegible] لیکن ملاقات والے [illegible]
[illegible] جیل [illegible] ملاقات کی اجازت [illegible]
[illegible] السلام علیکم [illegible]
[illegible] خط جلدی تحریر [illegible]
[illegible] عزیزہ فاطمہ کو اور بچوں کو پیار [illegible]

Signature of censoring officer	Date	Name of sender
	29.4.53	تاج محمود عفا اللہ عنہ

G.I.I.S.—5000—18-10-50—SGPP Lahore

ارسال کنندہ کا پورا نام	تاج محمود
مکتوب الیہ کا پورا نام	مولوی محمد صادق
مکتوب نگار کا مکتوب الیہ سے رشتہ	بھائی
پتہ	نئی لائن نمبر ۲۔ کوارٹرز کاٹن ملز۔ پتی گھر۔ لائل پور۔

نظر بند
کیمبل پور ڈسٹرکٹ جیل

برادرم مولوی محمد صادق صاحب!

السلام علیکم۔ مزاج شریف۔ مَیں نے پندرہ اپریل کو لاہور سنٹرل جیل سے ایک خط آپ کے نام تحریر کیا تھا۔ ۲۰ اپریل کو مجھے کیمبل پور جیل میں لایا گیا ہے۔ ملاقات بڑی مشکل ہے لہٰذا ملاقات کے لئے کوئی نہ آئے۔ البتہ خط تحریر کر کے گھر کے حالات، والد صاحب کی صحت، طارق محمود صاحب کے حالات تحریر کریں۔ گھر، گاؤں آپ کے جانے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ لفافے کے ذریعہ میرا خط والد صاحب کو بھیج دیا کریں۔ کیمبل پور سے ۲۲ اپریل کو مَیں نے والد صاحب کو خط لکھا تھا۔ نہ ان کا اور نہ آپ کا کوئی جواب موصول ہوا ہے۔ مجھے ہر ہفتے بچوں کی، اپنی، والدین کی خیریت کی اطلاع دیتے رہیں۔ والد صاحب کو مَیں نے تحریر کیا تھا کہ دو کرتے دو ٹوپیاں ململ، ایک شلوار تیار کروا کر بھیج دیں۔ محمد ربانی نزدیک ہے لیکن ملاقاتی وہاں اپنے تھانہ کے تھانیدار سے تحریر کرا کے لائے کہ مَیں اس کا حقیقی بھائی ہوں تب جا کر جیل والے ملاقات کی اجازت دیں گے وہ بھی جمعرات کی صبح کو۔

سب عزیزوں، رشتہ داروں اور میرے ذاتی دوستوں کو السلام علیکم قبول ہو۔ مسجد ریلوے میں جمعہ وغیرہ کا کیا انتظام ہے؟ سب نمازیوں کو السلام علیکم قبول ہو۔ خط جلدی تحریر کریں۔ مَیں

بالکل خیریت سے ہوں۔ عزیز فاطمہ کو اور بچوں کو پیار۔ شمیوں اور اشفاق کا کیا حال ہے؟ والسلام

ارسال کنندہ کا نام

تاج محمود

تاریخ۔ ۲۹-۴-۵۳

ارسال کنندہ کا نام — تاج محمود

مکتوب الیہ کا نام — مولوی محمد صادق

مکتوب الیہ سے مکتوب نگار کا رشتہ — بھائی

پتہ — مولوی محمد صادق نئی لائن نمبر ۲
کوارٹرز کاٹن ملز۔ لائل پور

نظر بند
سنٹرل جیل لاہور

برادرم مولوی محمد صادق!

السلام علیکم۔ مزاج شریف لاہور سنٹرل جیل میں چھ ماہ کے لئے نظر بند ہوں اور خیریت سے ہوں۔ صرف ضعیف اور بیمار والدین کی پریشانی کے خیال سے پریشان ہو جاتا ہوں۔ انہیں جا کر سلام کہنا اور تسلی کے لئے کہنا۔ ان کی بیماری، بچوں کی عزت آبرو اور رزق کے لئے خدا کو کفیل یقین کرتا ہوں۔

طارق محمود، رانی، سلیمہ کنیز اور فریعہ کو پیار۔ عزیز فاطمہ کو السلام علیکم۔ چھوٹی بچی کو اور شتاق کو پیار۔ غلام سرور اور اس کے بچوں کو چاندبی بی کو سب کو السّلام علیکم۔ مسجد کے سب دوستوں کو سلام پہنچا دیں۔ محمد زمان اور قاضی بھائیا۔ محمد اشرف، نواب سب کو السلام علیکم۔

طارق محمود کی سائیکل گاؤں پہنچا دیں۔ اقبال اور غلام مرتضیٰ کو پیار۔

مجھے آپ سب لوگ خط لکھ سکتے ہیں لیکن صرف ذاتی باتیں لکھیں۔ ملکی حالات نہ لکھیں۔ میرے لئے ململ کے دو کرتے اور ململ کی دو صدفیانہ ٹوپیاں سِلوا کر کچھ کپڑے دھونے کا صابن نہانے کا صابن وغیرہ حاجی غلام حسین بٹ کی معرفت بھیج دیں۔ وہ باہر سے اندر بھیج دے گا اسی کی اجازت ہے آپ خود اندر آنے کی کوشش نہ کریں صرف غلام سرور مجھے مل سکتا ہے لیکن وہ بھی نہ آئے۔ یہاں مارشل لاء وغیرہ ہے اور وہ ناواقف ہے۔ حکیم محمد حسین (امین پور بازار) سے بھی پتہ کرلیں۔ شیخ فیروزالدین ڈکشمبر ہاؤس ریل بازار کو مل کر انہیں حسن ظفر اقبال فیروز افضال محمود۔ نذر۔ سیف سب کو السلام علیکم۔

ارسال کنندہ کا نام

تاج محمود عفا اللہ عنہٗ ...... دستخط افسر مجاز

تاریخ۔ ۱۵۔۴۔۵۲ ۲۔۵۔۵۲

جہادِ آزادی کے سرخیلِ مولانا ظفر علی خان کے غیر مطبوعہ اور نایاب

خطوط، ٹیلی گرامز اور نادر قلمی تحریروں کا دلکش تاریخی مرقع،



مکاتیب ظفر علی خان

از۔ زاہد منیر عامر



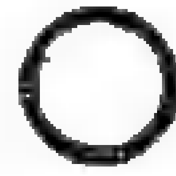
جس میں

○ تحریک حریت کے پوشیدہ گوشے ○ غیر ملکی استعمار کی چالیں
○ محققین کی لغزشیں اور ○ مختلف چہروں کے حقیقی خد و خال

پہلی بار سامنے آرہے ہیں

ادارہ مطالعہ تاریخ و تحقیق
۹۲۔ اسلام پورہ سرگودھا

ملنے کے پتے



ادارہ مطالعہ تاریخ و تحقیق	۹۲۔ اسلام پورہ سرگودھا
مکتبہ لولاک	ریلوے کالونی۔ فیصل آباد
دفتر مرکزیہ مجلس تحفظ ختم نبوت	حضوری باغ روڈ۔ ملتان
ذوالنورین اکادمی	۱۲۔ اے شاہ جمال لاہور
المکتبۃ الحسینیۃ	بلاک نمبر ۱۸۔ سرگودھا



- تحریک آزادی کا کوئی بھی مورخ اس کتاب کو اور اس کے مندرجات کو نظر انداز کر کے آگے نہیں بڑھ سکے گا۔ — احمد ندیم قاسمی
- سب سے اہم بات یہ ہے کہ مصنف نے اتنے بڑے موضوع کو اس ایک کتاب میں جذب کر لیا ہے اور کہا جا سکتا ہے کہ ہر ضروری بات اس کتاب میں آگئی ہے۔ — ڈاکٹر سید عبداللہ
- اس دلچسپ اور قابلِ مطالعہ کتاب سے شاہ صاحب کی شخصیت بڑی خوبی سے ابھر کر ہمارے سامنے آتی ہے۔ — ڈاکٹر وزیر آغا
- مصنف کی یہ کاوش خاص طور سے قابلِ تحسین ہے۔ — مولانا محمد منظور نعمانی
- اس کتاب نے برصغیر کے بطل حریت حضرت امیر شریعت کی یاد کو تازہ کر دیا ہے۔ — نسیم حجازی
- یہ کتاب امیرِ شریعت کی سیاسی زندگی کا باریک بینی سے مطالعہ کرنے کے لئے ایک عمدہ اساسی نمونہ ثابت ہو سکتی ہے۔ — مولانا کوثر نیازی
- شاہ صاحب کے متعلق بہت کچھ پڑھا اور بہت کچھ سنا مگر حقیقت یہ کتاب پڑھنے کے بعد کھلی۔ — مفتی عبدالرحمٰن خلیل

ایک عہد آفریں کتاب

سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ اور پاکستان

مصنفہ

زاہد منیر عامر

○ مجلد ○ حسین سرورق ○ ضخامت دو سو سے زائد صفحات ○ قیمت پندرہ روپے

ادارہ مطالعہ تاریخ و تحقیق

92- اسلام پورہ سرگودھا

حالات
و
مکتوبات

مولانا

زاہد منیر عامر